جلد 3/ شمارہ 3

تفقہ فی الدین کا داعی ادارہ

مارچ ۲۰۲۳ء

ماہ نامہ

مفاہیم

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

- ٹیکنالوجی نے ہمیں کیسے تبدیل کیا؟
- رمضان کی تیاری شعبان میں کریں
- فنِ بلاغت

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

اقبال

ماہنامہ مفاہیم کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کا داعی ادارہ

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب

مدیر

صوفی جمیل الرحمن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مضامین

نعت	جن کے کہلاتے ہیں ہم	مولانا محمد ذکی کیفی	۴
اداریہ	زلزلے اور آفتیں	مدیر	۵
درسِ قرآن	لغو اور بے ہودہ محافل سے اجتناب	مولانا محمد اقبال	۹
درسِ حدیث	استقبالِ رمضان	ابنِ عباس	۱۴
تنقیدِ مغرب	ٹیکنالوجی نے ہمیں کیسے تبدیل کیا؟(۱)	ڈاکٹر محمد رشید ارشد	۱۹
مقالات	جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے (۴)	مولانا حماد احمد ترک	۲۸
مقالات	رمضان کی تیاری شعبان میں کریں	صوفی جمیل الرحمان عباسی	۳۸
مقالات	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۲۰)	صوفی جمیل الرحمٰن عباسی	۴۷
فقہیات	القواعد الفقهية: القاعدة الثامنة	مفتی نذیر احمد ہاشمی	۵۳
تسلوتک	شبِ براءَت کی عبادت	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۵۵
ادبیات	فنِ بلاغت	علامہ شبلی نعمانی	۵۸

مولانا محمد ذکی کیفی
ابنِ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع، معروف شاعر

جن کے کہلاتے ہیں ہم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اپنی بد حالی سے یہ کہتے بھی شرماتے ہیں ہم
جا پڑیں قدموں پہ اُن کے، جن کے کہلاتے ہیں ہم

آپ کا جب ذکر چھِڑتا ہے کسی عنوان سے
گوش بر آواز بزمِ دو جہاں پاتے ہیں ہم

جیسے صحرا میں بگولہ، جیسے دریا میں حَباب
سوے طیبہ اس طرح سے جھومتے جاتے ہیں ہم

آپ کے در کے گدائے بے نوا بن کر رہیں
یہ ملِے دولت تو ہر دولت کو ٹھکراتے ہیں ہم

کوئی عالَم ہو، انہی کا نام ہے وردِ زباں
ایک نغمہ ہے جسے ہر ساز پر گاتے ہیں ہم

زندگی کی ہر کٹھن منزل میں جب بھی دیکھیے
آپ کے نقشِ قدم کو رہنما پاتے ہیں ہم

* * * * *

مدیر
ماہنامہ مفاہیم، کراچی

زلزلے اور آفتیں

ایک بار نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی: «اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي شَامِنَا وَفِي يَمَنِنَا» (صحیح بخاری) "اے اللہ ہمارے شام اور ہمارے یمن میں ہمیں برکت عطا فرما"۔ لوگوں نے عرض کی: "یا رسول اللہ! ہمارے نجد کے لیے بھی دعا فرمایئے"۔ آپ ﷺ نے انکار تو نہ فرمایا لیکن پہلے والی دعا ہی کو دہرایا: «اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي شَامِنَا وَفِي يَمَنِنَا» "اے اللہ ہمارے شام اور ہمارے یمن میں ہمیں برکت عطا فرما"۔ لوگوں نے بارگاہِ رسالت میں دوبارہ نجد کے لیے دعا کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «هُنَاكَ الزَّلاَزِلُ وَالفِتَنُ وَبِهَا يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ» "یہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور یہیں سے شیطان کا سینگ ظاہر ہوگا"۔

غور کیجیے شام اور یمن کی برکت کے مقابلے میں آپ ﷺ نے زلزلوں اور فتنوں کا ذکر فرمایا، بادی النظر میں یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ کسی علاقے کے بابرکت ہونے کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ زلزلوں اور فتنوں سے محفوظ ہو اور کسی علاقے کی برکت سے محرومی کثرت فتن و زلازل کو مستلزم ہے، لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ باجود اپنی برکت کے، تاریخی طور پر کئی بار ارضِ شام کو نہ صرف قدرتی آفات و مصائب مثلًا زلزلے وغیرہ سے دوچار ہونا پڑا بلکہ کئی بار اس ارضِ مقدس کو انسانی مصائب یعنی تاخت و تاراج کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ تو بابرکت ہونا ایک الگ بات ہے اور آزمائش سے دوچار ہونا ایک الگ بات ہے۔ حدیثِ مندرجہ بالا میں برکتِ شام کے مقابلے میں نجد کے زلزلے کو جو پیش کیا گیا تو اس کی آسان توجیہ یہ ہے کہ زلزلے مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ کبھی تو باعثِ فتنہ ہوتے ہیں اور کبھی باعثِ فتنہ نہیں ہوتے۔ کبھی یہ فتنے کا نتیجہ ہوتے ہیں

اور کبھی فتنے کا نتیجہ نہیں بھی ہوتے۔ کبھی یہ گناہوں کی سزا کے طور پر آتے ہیں اور کبھی یہ رحمتوں میں اضافے کے ذریعے کے طور پر نازل کیے جاتے ہیں۔ پس زلزلہ بابرکت علاقے یا مسلمان شخص پر بھی آئے گا اور زلزلہ کسی کافر یا ظالم شریر خطے پر بھی آئے گا، لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ ایک کے لیے رحمت ہو اور ایک کے لیے زحمت۔ اور رحمت و زحمت ہونے کا انحصار زلزلے کی نوعیت و شدت پر نہیں بلکہ اس قوم و ملک کی حالتِ نفسی پر ہو گا، اور اس حالت کے جانچنے کا کوئی پیمانہ ہمارے پاس نہیں بلکہ خالقِ حقیقی کے پاس ہے اور وہی دلوں کے بھید سے واقف ہے۔ ہم تو ظاہر کے مطابق حکم لگائیں گے اور حکم بھی فرامینِ رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی روشنی میں لگائیں گے۔ اب ظاہری صورتِ حال یہ ہے کہ اہلِ ترک و شام، ہماری طرح مسلمان ہیں۔ ان پر آنے والا زلزلہ کافروں پر آنے والے زلزلے کی مانند نہیں بلکہ ''مسلمان زلزلے'' کی طرح ہے کہ جو بعضوں کی بخشش اور بعضوں کے درجات کی بلندی کے لیے لایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں چند باتیں یاد رکھنے کی ہیں: پہلی بات یہ ہے کہ دنیا آزمائش و امتحان کی جگہ ہے۔ اور امتحان و آزمائش اچھے حالات میں بھی ہوتی ہے اور برے حالات میں بھی۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ﴾ (الانبیاء:۳۵) ''اور ہم اچھے اور بُرے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کریں گے، آخر کار تمھیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے''۔ تو اصل جزا و سزا تو اللہ کی طرف لوٹائے جانے کے بعد ہے، اس سے پہلے جو کچھ بھی ہے وہ آزمائش ہی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: «لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا بَلَاءٌ وَفِتْنَةٌ» (سنن ابنِ ماجہ) ''دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں بچا مگر ابتلا کے اور آزمائش کے''۔ اس حدیث کا مطلب ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے آزمائشیں اور فتنے لامحالہ واقع ہو کر رہیں گے۔

دنیاوی آزمائشوں کو عذاب بھی کہا گیا ہے لیکن دنیا کا یہ عذاب آخرت کے اعتبار سے رحمت ہی ہے۔ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: «أُمَّتِي هَذِهِ أُمَّةٌ مَرْحُومَةٌ لَيْسَ عَلَيْهَا عَذَابٌ فِي الْآخِرَةِ عَذَابُهَا فِي الدُّنْيَا الْفِتَنُ وَالزَّلَازِلُ وَالْقَتْلُ» (سنن ابی داؤد) ''میری امت پر رحم کیا گیا ہے کہ اس پر آخرت کا عذاب نہیں ہے بلکہ اس کا عذاب دنیا ہی میں ہے اور وہ فتنے، زلزلے اور قتل وغیرہ ہے''۔ یہ بہت اہم روایت ہے

کہ ایک طرف تو دنیاوی مصائب کو عذاب قرار دیا گیا لیکن دوسری طرف دنیا کے اس عذاب کو رحمت بھی قرار دے دیا گیا بایں معنی کہ اس سزا کے ملنے کے بعد آخرت کے عذاب سے امت کو رستگاری ملے گی اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہے۔ایک حدیثِ پاک میں دنیاوی سزا کو بہتر قرار دیا گیا اس لیے کہ دنیا کی سزا آخرت کی شدید سزا سے انسان کو بچاتی ہے: «إِذَا أَرَادَ اللهُ بِعَبْدِهِ الْخَيْرَ عَجَّلَ لَهُ الْعُقُوبَةَ فِي الدُّنْيَا وَإِذَا أَرَادَ اللهُ بِعَبْدِهِ الشَّرَّ أَمْسَكَ عَنْهُ بِذَنْبِهِ حَتَّى يُوَافِيَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». (سننِ ترمذی) ”جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو دنیا ہی میں سزا دے دیتا ہے اور جب اللہ کسی بندے سے برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے گناہ کی سزا کو آخرت تک موخر کر دیتا ہے پھر آخرت میں اسے بھرپور سزا دے گا“۔

دنیا کے عذاب یا سزائیں گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہیں۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا يُصِيبُ الْمُؤْمِنَ مِنْ مُصِيبَةٍ حَتَّى الشَّوْكَةِ إِلا قُصَّ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ أَوْ كُفِّرَ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ» (صحیح مسلم) ”بندۂ مومن کو کوئی مصیبت نہیں پہنچتی یہاں تک کہ اسے ایک کانٹا بھی چبھتا ہے مگر اس کی وجہ سے اس کے گناہ جھاڑ دیے جاتے ہیں“۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا كَثُرَتْ ذُنُوبُ الْعَبْدِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ مَا يُكَفِّرُهَا ابْتَلَاهُ اللهُ بِالْحُزْنِ لِيُكَفِّرَهَا عَنْهُ» (مسندِ احمد) ”جب بندے کے گناہ زیادہ ہو جائیں اور کفارے کا کوئی راستہ نہ ہو تو اللہ اسے دکھوں سے آزماتا ہے تاکہ اس کے گناہ معاف کر دے“۔ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیاوی آزمائشوں سے مسلمان کے درجات بھی بلند ہوتے ہیں فرمایا: «مَا يُصِيبُ الْمُؤْمِنَ مِنْ شَوْكَةٍ فَمَا فَوْقَهَا إِلا رَفَعَهُ اللهُ بِهَا دَرَجَةً، أَوْ حَطَّ عَنْهُ بِهَا خَطِيئَةً» (صحیح مسلم) ”بندۂ مومن کو ایک کانٹا بھی چبھتا ہے یا اس سے بڑھ کو کوئی مصیبت لاحق ہوتی ہے مگر اس کی وجہ سے یا تو اللہ اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے یا اس کا ایک گناہ معاف فرماتا ہے“۔دنیاوی آزمائشیں درجات کی بلندی کے لیے بھی ہوتی ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ مَنْزِلَةٌ لَمْ يَبْلُغْهَا بِعَمَلِهِ ابْتَلَاهُ اللهُ فِي جَسَدِهِ أَوْ فِي مَالِهِ أَوْ فِي وَلَدِهِ ثُمَّ صَبَّرَهُ عَلَى ذَلِكَ حَتَّى يُبَلِّغَهُ الْمَنْزِلَةَ الَّتِي سَبَقَتْ لَهُ» (مسندِ احمد) ”جب اللہ تعالیٰ کسی بندے

کے لیے کسی درجے کا فیصلہ فرمادیتا ہے اور وہ بندے اس مقام کا حامل نہ ہو تو اس کے جسم، اس کی اولاد اور اس کے مال میں اسے آزما کر اسے صبر کی توفیق دیتا ہے یہاں تک (کہ اس صبر کی بدولت) وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے“۔

دنیا میں دکھ درد اور ابتلا حسبِ دین آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا سب سے بڑی مشکلات کس کی ہوتی ہیں؟ فرمایا: «الأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الأَمْثَلُ فَالأَمْثَلُ فَيُبْتَلَى الرَّجُلُ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ فَإِنْ كَانَ دِينُهُ صُلْبًا اشْتَدَّ بَلاَؤُهُ وَإِنْ كَانَ فِي دِينِهِ رِقَّةٌ ابْتُلِيَ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ فَمَا يَبْرَحُ الْبَلاَءُ بِالْعَبْدِ حَتَّى يَتْرُكَهُ يَمْشِي عَلَى الأَرْضِ مَا عَلَيْهِ خَطِيئَةٌ» (سننِ ترمذی) ”سب سے بڑی مشکلات انبیا کی ہوتی ہیں، پھر ان کے کم رتبے والوں کی، پھر ان سے کم رتبے والوں کی اور پھر ان سے بعد والوں کی۔ اور اللہ تعالیٰ بندے کو اس کے دین کی مضبوطی کے حساب سے ہی آزماتا ہے۔ اگر اس کا دین مضبوط ہو تو آزمائش سخت کرتا ہے اور اگر دینداری ہلکی ہو تو آزمائش بھی ہلکی کرتا ہے۔ اور بندے پر مشکلات آتی رہتی ہیں یہاں تک کہ وہ زمین پر اس حال میں چلتا ہے کہ اس کے جسم پر کوئی گناہ باقی نہیں بچتا“۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی بڑی مصیبت آئے گی اتنا ہی اجر بھی بڑا عطا کیا جائے گا اور یہ آزمائشیں اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ لوگوں پر بھیجتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ عِظَمَ الجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ البَلاَءِ، وَإِنَّ اللهَ إِذَا أَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلاَهُمْ، فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا، وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ» (سننِ ترمذی) ”بے شک اجرِ عظیم بڑی آزمائش ہی کے ساتھ ہے اور جب اللہ کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اس کو آزماتا ہے، پس جو آزمائش پر راضی رہا تو اس کے لیے اللہ کی رضا ہے اور جو آزمائش پر ناراض ہوا تو اس کے لیے اللہ کی ناراضی ہے“۔ ایک روایت میں آتا ہے: «إِنَّ اللهَ إِذَا أَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ، فَمَنْ صَبَرَ فَلَهُ الصَّبْرُ، وَمَنْ جَزِعَ فَلَهُ الْجَزَعُ» (مسندِ احمد) ”جب اللہ کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو انھیں آزماتا ہے، پس جو صبر کرے گا اسے صبر کی توفیق دی جائے گی اور جو جزع فزع کرے گا اس کے لیے جزع فزع ہی ہے۔ آزمائشوں کی بہت سارے فائدے ہیں لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرنا چاہیے کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ آزمائش میں صبر نہ کر سکے۔

* * * * *

مولانا محمد اقبال
رکنِ شعبہ تحقیق وتصنیف

لغو اور بے ہودہ محافل سے اجتناب

سورۃ الفرقان آیت:۷۲

﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾

”اور (رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو ناحق کاموں میں شامل نہیں ہوتے اور جب کسی لغو چیز کے پاس سے گزرتے ہیں تو وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں“۔

تفسیر وتوضیح

سورۃ الفرقان کی آخری آیات میں اللہ تعالیٰ کے مخصوص اور مقبول بندوں کے خاص اوصاف کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ ان اوصاف کے بیچ میں گناہوں میں مبتلا ہونے کے بعد توبہ کر لینے کے احکام کا ذکر آیا اور اب باقی اوصاف میں سے یہاں حسب بالا مذکورہ آیت کے مطالعے کے ضمن میں ایک اور وصف کا ذکر کیا جائے گا۔

﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ﴾ ”اور (رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو ناحق کاموں میں شامل نہیں ہوتے“۔ قرآنِ کریم میں اصل لفظ ” زُور“ استعمال ہوا ہے جس کا مادہ زا، واؤ، را، پر مشتمل ہے، اس کے معنی ہیں ٹیڑھا ہونا۔ اسی سے ”زُور“ ہے، یعنی جھوٹ؛ اس لیے کہ جھوٹ میں حق سے روگردانی اور اس کے خلاف باطل کی طرف جھکاؤ ہوتا ہے۔ (معجم مقاييس اللغة، ج:۳، ص:۳۶) اسی طرح جھوٹی گواہی کے لیے شہادۃ الزور کے الفاظ آتے ہیں۔ یہاں مذکورہ آیتِ کریمہ میں ”زُور“ کے مصداق میں مختلف اقوال

ہیں؛ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما، ابو العالیہ، طاؤس، محمد بن سیرین، ضحاک، ربیع بن انس رحمہم اللہ نے فرمایا کہ اس سے مراد مشرکین کی عیدیں ہیں۔ (قرطبی، ج:۱۳، ص:۷۹، ابنِ کثیر: ج:۶، ص:۱۳۰) مجاہد اور محمد بن حنفیہ رحمہما اللہ نے فرمایا کہ اس سے مراد گانے بجانے کی محفلیں ہیں۔ (قرطبی، ج:۱۳، ص:۸۰) عمرو بن قیس رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بے حیائی اور ناچ رنگ کی محفلیں مراد ہیں۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے زہری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ اس سے شراب پینے پلانے کی مجلسیں مراد ہیں۔ (ابنِ کثیر، ج:۶، ص:۱۳۰) حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ایک تفسیر یہ بھی منقول ہے کہ یہاں زُور کی مجالس سے ایسی مجالس مراد ہیں، جن میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا جائے۔ (رازی، ج: ۲۴، ص:۴۸۷) مذکورہ بالا اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر باطل اور معاصی پر مشتمل محفل "زُور" میں داخل ہے۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے تفسیرِ مظہری کے حوالے سے نقل فرمایا ہے کہ: "حقیقت یہ ہے کہ ان اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، یہ ساری ہی مجلسیں مجلسِ زُور کی مصداق ہیں۔ اللہ کے نیک بندوں کو ایسی محفلوں ہی سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ لغو اور باطل کا بالقصد دیکھنا بھی اس کی شرکت کے حکم میں ہے"۔ (معارف القرآن، ج:۶، ص:۵۰۷) بعض مفسرین نے ﴿لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ﴾ میں شہادت کے الفاظ سے گواہی مراد لی ہے اور آیت کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ یہ لوگ یعنی اللہ تعالیٰ کے منتخب بندے جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ کیونکہ جھوٹی گواہی گناہ کبیرہ ہے اور قرآن وسنت میں اس کی شدید مذمت آئی ہے۔ حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَلاَ أُنَبِّئُكُمْ بِأَكْبَرِ الكَبَائِرِ» قُلْنَا: بَلَى يَا رَسُولَ اللهِ، قَالَ: «الإِشْرَاكُ بِاللهِ، وَعُقُوقُ الوَالِدَيْنِ» وَكَانَ مُتَّكِئًا فَجَلَسَ فَقَالَ: «أَلاَ وَقَوْلُ الزُّورِ، وَشَهَادَةُ الزُّورِ، أَلاَ وَقَوْلُ الزُّورِ، وَشَهَادَةُ الزُّورِ» فَمَا زَالَ يَقُولُهَا، حَتَّى قُلْتُ: لاَ يَسْكُتُ. (بخاری، ۵۹۷۶) "کیا میں تمھیں سب سے بڑا گناہ نہ بتاؤں؟ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ضرور بتائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ٹیک لگائے ہوئے تھے، اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا: آگاہ ہو جاؤ جھوٹی

بات بھی اور جھوٹی گواہی بھی! آگاہ ہو جاؤ جھوٹی بات بھی اور جھوٹی گواہی بھی! نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسے مسلسل دہراتے رہے اور میں نے سوچا کہ اب نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خاموش نہیں ہوں گے (یعنی نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی بے چینی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی تھی)''۔ لہٰذا جھوٹی گواہی کی شناعت کو دیکھتے ہوئے بعض حضرات نے آیتِ مذکورہ میں ﴿لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ﴾ سے مراد جھوٹی گواہی لی ہے۔ مگر یہاں سیاق وسباق کی رعایت سے پہلے معنیٰ زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں اور امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے بھی شہادۃ الزور کے بجائے پہلے والے معنیٰ کو ترجیح دی ہے، فرماتے ہیں: والأظهر من السياق أن المراد: لا يشهدون الزور، أي: لا يحضرونه. (ابنِ کثیر، ج:٦، ص:١٣٠) ''سیاق وسباق سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ''زُور'' سے مراد بے ہودہ کاموں میں حاضر ہونا ہے، یعنی وہ لوگ لغو محافل میں حاضر نہیں ہوتے''۔

غیر مسلموں کے تہواروں اور دیگر معاصی کی محفلوں میں شرکت

یہاں مذکورہ بالا اقوال میں مشرکین کی عیدوں میں شرکت اور اسی طرح عمومی اعتبار سے فساق کی مجالس میں شرکت کو بھی ''زُور'' کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانے کے اعتبار سے یہ اہم رہنما نکتہ ہے، کیونکہ آج کل یہ فتنہ عام ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد رواداری کی آڑ میں غیر مسلموں کی عیدوں اور تہواروں میں شریک ہوتی ہے۔ اسی طرح معاصی سے بھرپور محفلوں میں شرکت کی شناعت بھی دلوں سے محو ہو گئی ہے اور اسے معمول کی زندگی کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ امام رازی رحمہ اللہ تفسیرِ کبیر میں اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: ويحتمل حضور كل موضع يجري فيه ما لا ينبغي ويدخل فيه أعياد المشركين ومجامع الفساق، لأن من خالط أهل الشر ونظر إلى أفعالهم وحضر مجامعهم فقد شاركهم في تلك المعصية، لأن الحضور والنظر دليل الرضا به، بل هو سبب لوجوده والزيادة فيه، لأن الذي حملهم على فعله استحسان النظارة ورغبتهم في النظر إليه. (رازی، ج:٢٤، ص:٤٨٧) ''یہاں ''مجالسِ زور'' میں ہر اس جگہ اور ہر اس مجلس میں شرکت کا احتمال موجود ہے جس

میں حاضر ہونا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں مشرکین کی عیدیں اور فساق کے اجتماعات بھی داخل ہیں، اس لیے کہ ہر وہ شخص جو اہل الشر کے ساتھ اختلاط رکھتا ہے اور ان کے افعال کو (بنظرِ استحسان) دیکھتا ہے اور ان کی محفلوں میں حاضر ہوتا ہے تو وہ لازمی طور پر اس گناہ میں ان کے ساتھ شریک ہوگا۔ اس لیے کہ ایسے مواقع پر حاضر ہونا اور انھیں دیکھنا اس پر رضامندی کی دلیل ہے، بلکہ اس کے وجود اور اس میں اضافے کا سبب ہے، کیونکہ در حقیقت ان محافل کو اچھا سمجھنا اور ان میں دلچسپی ظاہر کرنا ان کی حوصلہ افزائی کا باعث ہے"۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کے مذہبی تہواروں میں اور اسی طرح ایسی محفلوں میں جہاں کھلے عام معاصی کا ارتکاب ہو رہا ہو، شریک ہونا کسی طرح جائز نہیں ہے، کیونکہ ایسی محافل میں شریک ہونے سے گناہوں میں پڑنے کے واضح امکانات موجود ہیں۔ اگر گناہ کے ارتکاب سے بچ بھی جائے تب بھی اس کے اثرات سے محفوظ ہونا ممکن نہیں ہے اور کم از کم یہ طرزِ عمل ان کی حوصلہ افزائی کا باعث ضرور بنے گا، اس لیے اہل اسلام کو ایسی مجلسوں میں شرکت سے گریز کرنا چاہیے۔

﴿وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾ "اور جب کسی لغو چیز کے پاس سے گزرتے ہیں تو وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں"۔ یہاں "لغو" کے الفاظ آئے ہیں، جن کے معنی میں امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الأصح أن اللغو كل ما يجب أن يلغى ويترك، ومنهم من فسر اللغو بكل ما ليس بطاعة، وهو ضعيف لأن المباحات لا تعد لغوا. (رازی، ج:۲۴، ص:۴۸۶) "لغو کی درست تفسیر یہ ہے: ہر وہ کام لغو ہے جسے چھوڑنا واجب ہو، جبکہ بعض حضرات نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ لغو ہر اس کام کو کہا جاتا ہے جو ثواب کا کام نہ ہو، یہ تفسیر کمزور ہے، اس لیے کہ مباحات لغو میں شامل نہیں ہیں"۔ اس تفسیر کے مطابق "لغو" کا مفہوم ہے معصیت پر مشتمل کام، جس کی شناعت قرآن و سنت سے واضح ہے۔ اسی طرح یہاں "کراماً" کا مفہوم بھی واضح ہے، یعنی وہ لوگ جو لغو کام سے اعراض کرتے ہیں اور اس پر راضی نہیں ہیں، اس طرح کی مجالس کی طرف مائل ہوتے ہیں اور نہ ہی اس میں مشغول ہونے والوں کے ساتھ نشست و برخواست رکھتے ہیں"۔ (قرطبی، ج:۱۳، ص:۸۰) اس کی وضاحت قرآنِ کریم میں ایک اور جگہ اس طرح

آئی ہے:﴿وَإِذا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقالُوا لَنا أَعْمالُنا وَلَكُمْ أَعْمالُكُمْ سَلامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجاهِلِينَ﴾ (سورۃ القصص:۵۵) ”اور جب وہ کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اسے ٹال جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں، اور تمھارے لیے تمھارے اعمال۔ ہم تمھیں سلام کرتے ہیں، ہم نادان لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتے“۔ بہر حال، یہاں عباد الرحمٰن کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے کہ وہ بے ہودہ مجالس سے اعراض کرکے اور ان کے انعقاد میں کسی قسم کے تعاون سے بچتے ہوئے دور رہتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ کہیں سے گزر رہے تھے کہ راستے میں گانے کی آواز آئی تو انھوں نے چلنے کی رفتار تیز کردی اور وہاں سے جلدی نکل گئے۔ جب حضور ﷺ کو یہ خبر ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا:«لقد أصبح ابن أم عبد كريما» ”بے شک امِ عبد کا بیٹا (ابنِ مسعود) کریم یعنی باوقار طرزِ عمل کے مالک ہیں“ اور پھر مذکورہ آیت تلاوت فرمائی۔ (المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز، ج:۴، ص:۲۲۲) اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نیک بندے جہاں کسی ناجائز، لغو اور بے ہودہ کام میں شامل نہیں ہوتے، وہاں ان لوگوں کی تحقیر بھی نہیں کرتے، جو ان کاموں میں مبتلا ہیں، بلکہ ان کا طرزِ عمل تو یہ ہوتا ہے کہ برے کام کو برا جانتے ہوئے وقار و متانت کے ساتھ وہاں سے گذر جاتے ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اور ان میں یہ بات ہے کہ وہ بے ہودہ باتوں میں (جیسے لہو ولعب خلافِ شرع) شامل نہیں ہوتے اور اگر (اتفاقاً بلا قصد) بے ہودہ مشغلوں کے پاس ہو کر گزریں تو سنجیدگی (و شرافت) کے ساتھ گزر جاتے ہیں (یعنی نہ اس کی طرف مشغول ہوتے ہیں اور نہ ان کے آثار سے عاصیوں کی تحقیر اور اپنا ترفع اور تکبر ظاہر ہوتا ہے)“۔ (بیان القرآن، ج:۳، ص:۳۳)

* * * * *

ابنِ عباس
معاون قلم کار

استقبالِ رمضان

عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ، قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي آخِرِ يَوْمٍ مِنْ شَعْبَانَ فَقَالَ: «يا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ أَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيمٌ، شَهْرٌ مُبَارَكٌ، شَهْرٌ فِيهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ، جَعَلَ اللهُ صِيَامَهُ فَرِيضَةً، وَقِيَامَ لَيْلِهِ تَطَوُّعًا، مَنْ تَقَرَّبَ فِيهِ بِخَصْلَةٍ مِنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ أَدَّى فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ، وَمَنْ أَدَّى فَرِيضَةً فِيهِ كَانَ كَمَنْ أَدَّى سَبْعِينَ فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ»

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شعبان کی آخری تاریخ میں ہمارے سامنے وعظ کیا اور فرمایا: ”اے لوگو! تم پر ایک عظیم مہینا اپنا سایہ کرنے والا ہے۔ یہ بڑی برکت والا مہینا ہے، اس میں ایک رات ہے (شبِ قدر) جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے فرض جب کہ اس کی راتوں کا قیام (یعنی تراویح) کو سنت بنایا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں کسی نفل نیکی کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کرے گویا اس نے غیرِ رمضان میں فرض ادا کیا اور جو شخص اس مہینے میں کوئی فرض ادا کرے وہ ایسا ہے گویا اس نے غیرِ رمضان میں ستّر فرض ادا کیے“۔

«وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ، وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ، وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ، وَشَهْرٌ يُزَادُ فِي رِزْقِ الْمُؤْمِنِ، مَنْ فَطَّرَ فِيهِ صَائِمًا كَانَ لَهُ مَغْفِرَةً لِذُنُوبِهِ، وَعِتْقَ رَقَبَتِهِ مِنَ النَّارِ، وَكَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْتَقَصَ مِنْ أَجْرِهِ شَيْءٌ» قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ، لَيْسَ كُلُّنَا يَجِدُ مَا يُفْطِرُ الصَّائِمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ:

”یہ مہینا صبر کا ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے اور یہ باہمی ہمدردی اور غم خواری کا مہینا ہے۔ اس مہینے میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ کسی روزے دار کا روزہ افطار کرانا گناہوں کی معافی اور دوزخ سے خلاصی کا ذریعہ ہے۔ افطار

کرانے والے کو روزے دار کے ثواب کے برابر ثواب دیا جائے گا، البتہ روزے دار کے ثواب سے کچھ کم نہیں کیا جائے گا"۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: یا رسولَ اللہ! ہم میں سے ہر شخص تو اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ روزے دار کو افطار کرائے، تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

«يُعْطِي اللهُ هَذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلَى مَذْقَةِ لَبَنٍ أَوْ تَمْرَةٍ أَوْ شَرْبَةٍ مِنْ مَاءٍ، وَمَنْ أَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللهُ مِنْ حَوْضِي شَرْبَةً لَا يَظْمَأُ حَتَّى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ، وَهُوَ شَهْرٌ أَوَّلُهُ رَحْمَةٌ، وَأَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ، وَآخِرُهُ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ مَنْ خَفَّفَ عَنْ مَمْلُوكِهِ فِيهِ غَفَرَ اللهُ لَهُ وَأَعْتَقَهُ مِنَ النَّارِ»

"(یہ اجر پیٹ بھر کھلانے پر موقوف نہیں) یہ ثواب اللہ جل شانہٗ اس کو بھی دے گا جو ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی یا ایک گھونٹ لسی پر افطار کرا دے۔ اور جو کوئی روزے دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دے تو اللہ اسے میرے حوض سے پلائے گا، پھر جنت میں داخلے تک اسے پیاس نہ لگے گی۔ اس مہینے کا اول حصہ اللہ کی رحمت ہے، درمیانی حصہ مغفرت ہے، اور آخری حصہ آگ سے آزادی کا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں اپنے غلام (یا خادم) پر سے بوجھ ہلکا کر دے حق تعالیٰ شانہٗ اس کی مغفرت فرماتے ہیں اور آگ سے آزاد فرماتے ہیں"۔

«فَاسْتَكْثِرُوا فِيهِ مِنْ أَرْبَعِ خِصَالٍ، خَصْلَتَانِ تُرْضُونَ بِهَا رَبَّكُمْ، وَخَصْلَتَانِ لَا غِنَى لَكُمْ عَنْهُمَا، فَأَمَّا الْخَصْلَتَانِ اللَّتَانِ تُرْضُونَ بِهَا رَبَّكُمْ: فَشَهَادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَتَسْتَغْفِرُونَهُ، وَأَمَّا اللَّتَانِ لَا غِنَى لَكُمْ عَنْهُمَا فَتَسْأَلُونَ اللهَ الْجَنَّةَ، وَتَعُوذُونَ بِهِ مِنَ النَّارِ»شعب الإيمان للبيهقي

"چار کاموں کی اس مہینے میں کثرت کیا کرو، جن میں دو چیزیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ضروری ہیں اور دو چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے بغیر تمھارا گزارا نہیں ہو سکتا: رب کو راضی کرنے والی چیزیں کلمۂ طیبہ کا ورد اور استغفار کی کثرت ہے، اور دوسری دو چیزیں حصولِ جنت کی دعا اور دوزخ سے نجات طلب کرنا ہے"۔

فوائد: شعبان کے آخری دن میں رمضان کی عظمت بیان کرنے سے نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا اہتمامِ رمضان معلوم ہوتا ہے۔ یہ برکت کا مہینا ہے یعنی اس میں نیکیوں کے مواقع اور اس کا ثواب بڑھا دیا جاتا ہے۔ ماہِ رمضان کی برکتوں کا عروج شبِ قدر ہے جس کی عبادت کا ثواب ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ انسان کو شروع رمضان ہی سے شب قدر

کو پانے کی نیت کر لینی چاہیے۔ رمضان کا قیام یعنی تراویح کی مشروعیت کو اس روایت میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا۔ بعض روایات میں نبی کریم ﷺ نے تراویح کی مشروعیت وسنیت کو اپنی طرف منسوب کیا۔ اس سے تاکید مزید مطلوب ہے اور یہ بھی کہ اگرچہ تراویح کے مسنون ہونے کا بیان نبی کریم ﷺ نے واضح کیا ہے لیکن چوں کہ شارعِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں تو اس کی نسبت دونوں کی طرف جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ قیامِ رمضان کی بہت تاکید فرماتے تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جس نے رمضان کی راتوں کا قیام کیا تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اہلِ سنت کے تمام مسالک تراویح کے سنت ہونے پر متفق ہیں۔ یہاں خصوصیت سے ایک بات کا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ قرآن شریف کا تراویح میں پڑھنا یا سننا یہ مستقل سنت ہے اور پورے رمضان شریف کی تراویح ادا کرنا مستقل سنت ہے۔ بعض لوگ کسی مسجد میں آٹھ دس دن میں کلامِ مجید سن لیتے ہیں پھر وہ تراویح پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتے۔ اس سے ایک سنت پر عمل رہ جاتا ہے۔ البتہ جن لوگوں کو رمضان المبارک میں سفر یا کسی وجہ سے ایک جگہ روزانہ تراویح پڑھنی مشکل ہو، ان کے لیے مناسب ہے کہ اول مکمل قرآن شریف کچھ روز میں سن لیں تاکہ قرآن شریف ناقص نہ رہے پھر جہاں وقت اور موقع ملے وہاں تراویح پڑھ لیا کریں۔ اس طرح دونوں سنتوں پر عمل ہو جائے گا۔

اجر کی زیادتی: رمضان میں فرض کا اجر ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے اس لیے فرض نماز کی باجماعت ادائی کا خاص اہتمام کرنا چاہیے بالخصوص نمازِ فجر اور نمازِ مغرب کا خاص خیال کرنا چاہیے کہ بعض اوقات فجر سحری کے بعد کے آرام اور مغرب افطاری کی نذر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سننِ موکدہ وغیر موکدہ اور نوافل کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔

صبر کا مہینا: یہ صبر کا مہینا ہے، یعنی اگر روزے وغیرہ میں کچھ تکلیف ہو تو اسے ذوق شوق سے برداشت کرنا چاہیے، یہ نہیں کہ مار دھاڑ، ہَول پکار شروع کر دی جائے۔ رمضان کو غم خواری کا مہینا قرار دیا گیا۔ اس لیے اس مہینے میں غربا اور مساکین کے ساتھ مدارات کا برتاؤ کرنا اور جس قدر بھی ہمت ہو سکے اپنے اِفطار و سحر کے کھانے میں غربا کا حصہ بھی ضرور لگانا چاہیے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے روزہ افطار کرانے کی فضیلت ارشاد فرمائی۔ ایک اور روایت میں ہے: جو شخص حلال کمائی سے رمضان میں روزہ افطار کرائے اس پر رمضان کی راتوں میں فرشتے رحمت بھیجتے ہیں، اور شبِ قدر میں جبرئیل اس سے مصافحہ کرتے ہیں، اور جس سے حضرت جبرئیل مصافحہ کرتے ہیں (اس کی

علامت یہ ہے کہ) اس کے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے، اور آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ حماد بن سلمہ رحمہ اللہ- ایک مشہور محدث ہیں- روزانہ پچاس آدمیوں کے روزہ افطار کرانے کا اہتمام کرتے تھے۔ افطار کی فضیلت کے بعد فرمایا: اس ماہ کا اول حصہ رحمت ہے، یعنی: حق تعالیٰ شانہٗ کا انعام متوجہ ہوتا ہے، اور یہ رحمتِ عامہ سب مسلمانوں کے لیے ہوتی ہے، اس کے بعد جو لوگ اس کا شکر ادا کرتے ہیں ان کے لیے اس رحمت میں اضافہ ہوتا ہے: ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ﴾ اور اس کے درمیانی حصے سے مغفرت شروع ہوجاتی ہے؛ اس لیے کہ روزوں کا کچھ حصہ گزر چکا ہے، اس کا معاوضہ اور اکرام مغفرت کے ساتھ شروع ہوجاتا ہے، اور آخری حصہ تو بالکل آگ سے خلاصی ہے ہی، اور بھی بہت سی روایات میں ختمِ رمضان میں آگ سے خلاصی کی بشارتیں وارد ہوئی ہیں۔ رمضان کے تین حصے کرنے میں یہ اس معنی کا احتمال بھی ہے کہ آدمی تین طرح کے ہیں: ایک وہ لوگ جن کے اوپر گناہوں کا بوجھ نہیں، ان کے لیے شروع ہی سے رحمت اور انعام کی بارش ہوجاتی ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو معمولی گناہ گار ہیں، ان کے لیے کچھ حصہ روزہ رکھنے کے بعد ان روزوں کی برکت اور بدلے میں مغفرت اور گناہوں کی معافی ہوتی ہے۔ تیسرے وہ جو زیادہ گناہ گار ہیں، ان کے لیے زیادہ حصہ روزہ رکھنے کے بعد آگ سے خلاصی ہوتی ہے، اور جن لوگوں کے لیے ابتدا ہی سے رحمت تھی اور ان کے گناہ بخشے بخشائے تھے، ان کا تو پوچھنا ہی کیا! کہ ان کے لیے رحمتوں کے کس قدر انبار ہوں گے!! اس کے بعد حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک اور چیز کی طرف رغبت دلائی ہے، کہ آقا اپنے ملازموں یا غلاموں پر اس مہینے میں تخفیف کریں؛ اس لیے کہ آخر وہ بھی روزے دار ہیں، کام کی زیادتی سے ان کو روزے میں دقت ہوگی۔ اس کے بعد نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے رمضان المبارک میں چار چیزوں کی کثرت کا حکم فرمایا: اول: کلمہٗ شہادت، احادیث میں اس کو افضل الذکر قرار دیا گیا ہے، مشکوٰۃ میں بروایتِ ابو سعید خدری منقول ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ: یا اللہ! تو مجھے کوئی ایسی دعا بتلا دے کہ اس کے ساتھ میں تجھے یاد کیا کروں اور دعا کیا کروں، وہاں سے لا الہ الا اللہ ارشاد ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: یہ کلمہ تو تیرے سارے ہی بندے کہتے ہیں، میں تو کوئی دعا یا ذکرِ مخصوص چاہتا ہوں، وہاں سے ارشاد ہوا: اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور ان کے آباد کرنے والے میرے سوا یعنی ملائکہ اور ساتوں زمین

ایک پلڑے میں رکھ دیے جائیں اور دوسرے میں کلمۂ طیبہ رکھ دیا جائے تو وہ جھک جائے گا۔ایک حدیث میں وارد ہوا: جو شخص اخلاص سے اس کلمے کو پڑھے آسمان کے دروازے اس کے لیے فوراً کھل جاتے ہیں، اور عرش تک پہنچنے میں کسی قسم کی روک نہیں ہوتی بہ شرط کہ کہنے والا کبائر سے بچے۔ دوسری چیز جس کی کثرت کرنے کو حدیثِ بالا میں ارشاد فرمایا گیا وہ استغفار ہے، احادیث میں استغفار کی بھی بہت ہی فضیلت وارد ہوئی ہے: ایک حدیث میں ہے: جو شخص استغفار کی کثرت رکھتا ہے حق تعالیٰ شانہ ہر تنگی میں اس کے لیے راستہ نکال دیتے ہیں، اور ہر غم سے نجات نصیب فرماتے ہیں، اور اسے اس طرح روزی پہنچاتے ہیں کہ اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ ایک حدیث میں آیا: آدمی گنہگار تو ہوتا ہی ہے، گناہ گاروں میں بہترین وہ ہے جو توبہ کرتا رہے۔ ایک حدیث میں ہے: جب آدمی گناہ کرتا ہے تو ایک کالا نقطہ اس کے دل پر لگ جاتا ہے، اگر توبہ کرتا ہے تو وہ دھل جاتا ہے ورنہ باقی رہتا ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے دو چیزوں کے مانگنے کا امر فرمایا ہے جن کے بغیر چارہ ہی نہیں: جنت کا حصول اور دوزخ سے نجات۔ ہماری تمام عبادت و ریاضت کا محور یہی دو چیزیں، جنت کی فلاح اور دوزخ سے نجات۔ ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (آل عمران: ۱۸۵) ”پس جو دوزخ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ہو گیا“۔ تو رمضان کی تمام تر محنت کے بعد اس کا حاصل، دوزخ سے نجات اور جنت کی فلاح کی دعا مانگتے رہنا چاہیے۔ حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ” اے اللہ کے رسول! ہمارے لیے دعا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَارْضَ عَنَّا وَتَقَبَّلْ مِنَّا وَأَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ وَنَجِّنَا مِنَ النَّارِ وَأَصْلِحْ لَنَا شَأْنَنَا كُلَّهُ» ”اے اللہ! ہماری مغفرت فرما، ہم پر رحمت فرما، ہم سے راضی ہو جا، ہماری دعائیں قبول فرما، ہمیں جنت میں داخل فرما، ہمیں جہنم سے نجات دے اور ہمارے سارے کام سنوار دے“۔ ہم نے مزید دعا کے لیے خواہش کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا میں نے تمھارے لیے سب کچھ جمع نہیں کر دیا؟“۔ (تمام روایات، فضائلِ اعمال از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ماخوذ ہیں)

* * * * *

گفتگو: ڈاکٹر رشید ارشد
ٹرانسکرپشن: عبداللہ جان

ٹیکنالوجی نے ہمیں کیسے تبدیل کیا؟

قسط نمبر ۱

الحمدلله وحده والصلاة والسلام على من لا نبيَّ بعده، رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَ يَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ

ویسے تو یہ ایک بہت وسیع موضوع ہے لیکن کوشش ہوگی کہ اختصار کے ساتھ لفظ "ٹیکنالوجی" کا تعارف اور اس کے اثرات واضح کیے جاسکیں۔ جو عنوان ہے اس میں بنیادی طور پر تین کلیدی الفاظ ہیں، انہی سے بات کا آغاز کرتے ہیں۔ ایک لفظ ان میں ہے " ہم"۔ دوسرا لفظ ہے "ٹیکنالوجی"، اور تیسرا لفظ ہے "تبدیلی"، پہلے اس پر ذرا بات کر لیتے ہیں کہ ہم کون ہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کیا ہے؟ جس کے بارے میں ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ہمیں بدل رہی ہے، اور تیسرا پہلو یہ ہے کہ ٹیکنالوجی ہمیں کس طرح اور کیسے کیسے بدل رہی ہے۔

"ہم" کون ہیں؟

سب سے پہلے اگر "ہم" کی ہم بات کریں اس وقت آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں جو بنیادی اکائی کہہ لیں وہ Self ہے، Person ہے، یا اس کے لیے ایک لفظ استعمال ہوتا ہے Human۔ ہم بنیادی طور پر انسان ہیں۔ اور فلاں فلاں چیزیں گویا انسانیت کے لیے مسئلہ ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ ٹیکنالوجی

کے حوالے سے پوری دنیا میں یہ گفتگو ہو رہی ہے کہ اس نے انسانیت کو یا انسانوں کو کیسے تبدیل کیا ہے اور اس پر کیسے اثرانداز ہو رہی ہے، اس وقت جو ایک بڑا مسئلہ ہے دنیا کے بڑے مفکرین اور فلسفیوں کے ہاں، اس کو کہتے ہیں "Dehumanization": یعنی اس میں جو خطرہ درپیش ہے کہ انسان ہونے کا مطلب اب کیا ہوگا؟ UNESCO مختلف دن مناتی ہے، ایک "World Philosophy Day" بھی منایا جاتا ہے جس کے لیے انھوں نے نومبر کے مہینے کی تیسری جمعرات Third Thursday In November مقرر کر رکھی ہے۔ ہر اسی دن وہ "World Philosophy Day" مناتے ہیں اور یونیسکو والے ہر سال اس کا کوئی نہ کوئی Theme بھی دیتے ہیں کہ اس سال کا Theme یہ ہے، اس سال کا جو موضوع تھا اس کا Title یہ تھا: "The Forthcoming Human" کہ اب جو آگے آنے والا انسان ہے وہ کیا ہوگا اور جیسے لوگوں کے اندر ایک احساس ہو رہا ہے کہ انسان ہونے کا جو مطلب افلاطون سے لے کر کانٹ اور کانٹ سے لے کر مشل فوکو تک یہ انسان کا مطلب سمجھا جاتا تھا کیا انسان پر وہ Definitions عائد کی جا سکتی ہیں، 'Humanity' کو بھی ایک خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ کبھی آپ غور کریں جہاں پر بھی دنیا کے کچھ مفکرین جمع ہوتے ہیں اور یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس وقت انسانیت کو یا دنیا کو کون سے بڑے خطرات لاحق ہیں تو کبھی آپ غور کیجیے گا کہ ان میں سے بھی زیادہ تر کا تعلق سائنس اور ٹیکنالوجی سے ہے۔ مثال کے طور پر جو ایک بڑا مسئلہ لگتا ہے وہ Nuclear Catastrophe یا Nuclear Warfare ہے۔ اسی طرح ایک اور بڑا مسئلہ Climate Change کا ہے۔ ایک اور جو بڑا مسئلہ ہے وہ انسان کی بیگانگی یعنی Human Alienation یا انسان کے نفسی مسائل ہیں۔ میں نے تین چیزیں آپ کے سامنے رکھی ہیں کبھی آپ اس پر غور کریں ان تینوں کے پیچھے ہاتھ ٹیکنالوجی ہی کا ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ پوری دنیا میں مفکرین اور فلسفی ٹیکنالوجی کو 'Problematize' کر رہے ہیں، یعنی ایسا نہیں ہے کہ ہمیں بلاوجہ واہمہ ہو گیا ہے کہ ٹیکنالوجی انسانوں کے لیے یا انسانیت کے لیے خطرہ ہے، نہیں۔ اس پر بات ہو رہی ہے اور ہر جگہ ہو رہی ہے۔ لیکن میں یہ عرض کر رہا تھا کہ لوگوں کے نزدیک جو بنیادی unit ہے وہ "انسان" ہے۔ اور اصل میں تو ہم انسان ہی ہیں۔ اسی وجہ سے ایک خاص طرح کا humanism ہمارے ہاں بھی

پھیل رہا ہے اور یہ بات لوگ کہنے لگے ہیں کہ سب سے بڑا مذہب جو ہے وہ تو اصل میں انسانیت ہے، لیکن میں توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے موضوع میں جو لفظ ''ہمیں'' رکھا ہے اس میں، میں ''ہم'' کو انسان کے طور پر نہیں دیکھتا، یعنی میری ناقص رائے میں ہمارا جو ''Basic essence'' ہے وہ Human ہونا نہیں ہے بلکہ ہمارا 'Basic essence' بندہ ہونا ہے۔ یعنی یہ کہنا غلط بات ہے کہ ہم Essentially انسان ہیں، نہیں، بلکہ ہم Essentially بندے ہیں۔ یہ ایک پرانا تصور ہے۔ انسان کا ایک essence ہوتا ہے ایک Accident ہوتے ہیں جو اس کے ساتھ لگے ہوتے ہیں۔ تو ہمارے نقطۂ نظر سے بنیادی طور پر وجود دو ہی ہیں: ایک ''اللہ'' اور ایک ''ماسوا اللہ''۔ اور اللہ اور ماسوا اللہ میں ایک ہی تعلق ہے اور وہ تعلق یہ ہے کہ اللہ ''معبود'' ہے اور ماسوا اللہ سب کے سب ''عبد'' ہیں۔ اور میرا انسان ہونا یہ ایک Accident ہے۔ اور میرا بندہ ہونا یہ میرا essence ہے۔ میں اگر انسان نہ ہوتا تو جانور، پیڑ پودا ہوتا، پتھر وغیرہ یا میں کچھ بھی ہوتا، جس کو قرآن مجید شے کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے وہ اصل میں شے ہے۔ اور آپ کبھی غور کریں ما شاءَ اللّٰهُ فهو شيءٌ جو اللہ نے چاہا گویا وہ شے ہے، میں یہ توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ''ہم'' سے مراد کون ہے؟ تو ہم ''عباداللہ'' یعنی اللہ کے بندے ہیں۔ ہمیں کسی بھی مسئلے پر غور کرنا ہو وہ محض انسانیت کے رخ سے نہیں کرنا بلکہ ہمیں اس کو دیکھنا ہے کہ کوئی بھی چیز ہماری بندگی پر کیسے Affect کرتی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم کا مطلب ''عبد'' ہے اور ہم سب اللہ کے بندے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ تمام مخلوقات اللہ کی بندی یا بندے ہیں لیکن مخلوقات کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک قسم وہ ہے جس کو Free Will حاصل ہے۔ دوسری وہ جس کو Free Will حاصل نہیں ہے۔ تو تمام مخلوقات ایک لحاظ سے اللہ کے بندے ہیں۔ اور ایک عبادت بالاجبار ہے یا بالتسخیر ہے جو سب کو کرنی ہے۔ لیکن ایک عبادت بالخیار ہے یا عبادت بالاختیار کہہ لیں، وہ حکم ان لوگوں کو دیا گیا ہے جن کو Free Will دی گئی ہے اور قرآنِ مجید میں یہ موضوع مذکور ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ (الاحزاب:۷۲) ''بے شک ہم نے آسمانوں اور زمین

اور پہاڑوں پر امانت پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس امانت کو اٹھالیا۔ یقیناوہ زیادتی کرنے والا، بڑانادان ہے"۔ میر کا شعر ہے:

سب پہ جس بار نے گرانی کی　　　　اس کو یہ ناتواں اٹھالایا

انسان نے اس کو اٹھالیا اور جتنا ہمیں علم ہے تو دو مخلوقات کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ مکلف ہیں۔ یعنی "انسان" اور " جنات" اور ان کو Free Will حاصل ہے اور Free Will کا مطلب یہ ہے کہ یہ بندگی سے انکار کر سکتے ہیں۔ وہ بندگی جس کے لیے اللہ نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ قرآنِ مجید میں قصہ آدم وابلیس سات مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ اس کی بہت سی حکمتیں علما بیان کرتے ہیں لیکن ایک بہت بڑی حکمت جو اس قصے میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ Human Free Will کا اظہار ہے اور Free Will کا اظہار بات ماننے میں نہیں ہوتا، Free Will کا اظہار نافرمانی میں ہوتا ہے۔ یعنی فرشتے Free Will رکھتے ہیں یا نہیں رکھتے؟ قرآن مجید کہتا ہے: ﴿لَّا يَعْصُونَ اللهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ (التحریم:٦) "وہ احکامات کی نافرمانی نہیں کرتے، اور جو ان سے کہا جاتا ہے وہ کرتے ہیں"۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ Free Will ظاہر ہوتی ہے میری نافرمانی سے، آدم و حوا علیہما السلام دونوں کو منع کیا گیا تھا کہ آپ فلاں درخت کے پاس نہیں جائیں گے اور وہ چلے گئے۔ اب اس پورے واقعے میں کتنی حکمتیں ہیں وہ تو اللہ جانتا ہے لیکن ایک بہت بڑی حکمت وہ آدم علیہ السلام کی "Free Will" کا اظہار ہے۔ کہ آدم وہ ہے جو معصیت کر سکتا ہے۔ اور انسان صرف انکار نہیں کر سکتا، انسان کے اندر سرکشی اور تمرّد کا بیج بھی ہے یہاں تک کے انسان خدا کے مقابل بھی آسکتا ہے اور وہ خدائی اور الوہیت کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے۔ ابھی اس کو دیکھیں گے کہ ٹیکنالوجی سے اس کا کیا تعلق ہے۔ بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ "ہم" سے مراد یہاں پر بندے ہیں، اور ہماری سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ ہم اللہ کہ بندے ہیں۔ اور اس کے ساتھ جو ضمنی شناخت جڑی ہوئی ہے وہ یہ کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی امت ہیں۔

ٹیکنالوجی کا روایتی تصور

اب اگلی بات یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کو Traditionally کیسے دیکھا جاتا ہے؟ Modern Technology کیا ہے؟ اس کی کیا Dynamics ہیں؟ ٹیکنالوجی کا جو Original تصور تھا وہ کیا تھا؟ مثال کے طور پر اگر ہم فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ارسطو نے مقاصدِ علم متعیّن کیے کہ علم یا زندگی کے مقاصد کیا ہیں۔ اس میں سب سے پہلے نمبر پر رکھا تھا ''معرفتِ حقیقت'' یعنی حقیقت کو جاننا، Meditation,Contemplation, اور Reality کو دیکھنا اور اس پر غور و فکر کرنا۔ دوسرے نمبر پر رکھا تھا: ''How To Live A Moral Life '' مجھے ایک Ethical Being کیسے بننا ہے۔ اگر اس کو ہم مذہبی معنوں سے جوڑ لیں تو دین بھی ہم سے دو مطالبے کرتا ہے ''ایمان اور عمل صالح'' مجھے کچھ چیزیں ماننی ہیں جس کا تعلق میرے ذہن اور فکر سے ہے اور مجھے کچھ کرنا ہے۔ تو اب آپ دیکھ لیں سب سے پہلے کیا ہے، ''حقیقت کی معرفت'' اور اس کے بعد کیا ہے کہ ایک اخلاقی وجود بننا۔ اور تیسرے نمبر پر اس نے کہا ہے Techne یعنی طاقت۔ اس میں Artifacts بھی آ گئے اور اس کے اندر Tools بھی آ گئے۔ انسان کو دنیا میں رہنا ہے اور اپنے نفس کو برقرار رکھنا ہے تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ طاقت چاہیے کچھ نہ کچھ ایسے ذرائع چاہیے جس سے اس کی Sustenance ہو سکے۔ اس لیے عام طور ہمارے ہاں ٹیکنالوجی کی جو بنیادی تعریف کی جاتی ہے کہ ٹیکنالوجی کہتے ہیں Applied Science کو اور اس سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے پہلے سائنس ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد اس سے ٹیکنالوجی پھوٹتی ہے لیکن شاید ایسا نہیں ہے۔ اگر آپ انسانیت کے اعتبار سے دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ ٹیکنالوجی پہلے ہے اور سائنس بعد میں ہے۔ جیسے basic technology کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ basic technology کیا ہے؟، مثلاً fire، یہ ایک ٹیکنالوجی ہے دو پتھر رگڑے گئے یا ایک خاص قسم کے درخت کے دو پتوں کو جب آپس میں رگڑا گیا تو اس سے چنگاری پیدا ہو گئی۔ تو آگ انسان کے بنیادی وجود کی Sustenance کے لیے۔ یعنی اس کی خوراک کے لیے اور پھر اس کو گرم رکھنے کے لیے ایک بنیادی ٹیکنالوجی ہے جو بالکل شروع میں سامنے آ گئی۔ مثال کے طور پر wheel ہے جس کو ہم پہیہ کہتے ہیں، یہ جو پہیے کا معاملہ ہے یہ بھی کوئی ایسا تھوڑی تھا کہ اس کے پیچ میں کوئی تھیوریٹیکل یا نظریاتی سائنس تھی اور اس کی بنیاد پر پہیہ ایجاد کیا گیا۔ اسی طرح جو Alphabets ہیں جس کو ہم

Writing کہتے ہیں، بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک ٹیکنالوجی ہے کیونکہ ہمارا تصور یہ رہا ہے کہ انسانیت میں بہت عرصے تک جو Tradition تھی وہ Oral Tradition تھی اور Written Tradition تو ایک خاص phase کے بعد آئی ہے۔

میں ان تمام مثالوں سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ٹیکنالوجی ایک خاص معنوں میں سائنس سے پہلے ہے۔ اور اگر آپ دینی لحاظ سے بات کریں تو ٹیکنالوجی وہ چیز ہے جو بنیادی ضروریات پوری کرنے میں انسان کی مدد کرتی ہے۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو طرح کی چیزیں رکھی ہیں۔ ایک طرح کی چیزیں انسان کے اندر ایسی ہیں کہ اس کا تعارف مُثْبَتْ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ''فطرت'' کا لفظ ہے یہ ہماری دینی Vocabulary میں ایک Positive لفظ ہے۔ اسی طریقے سے روح کا لفظ ہے، روح کا لفظ بھی اپنے اندر بڑائی اور عظمت کے معنی رکھتا ہے۔ اسی طرح قلب مُثبت معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح عقل ہے، ضمیر ہے جو اس نوعیت کے مثبت Traits ہیں۔

اور پھر انسان کے اندر نفسِ امّارہ اور جبلتیں ہیں جن کو Instincts کہا جاتا ہے۔ اور انسان کے اندر شہوت اور غضب ہے۔ تو ایک طالبِ علم کی حیثیت سے مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ جو قلب، ضمیر، روح یا عقل ہے یہ اصل میں انسان کو اللہ تعالیٰ سے متعلق رہنے کے لیے دیے گئے ہیں اور یہ ان کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اور یہ جو نفسِ امّارہ اور جبلتیں دی گئی ہیں یہ ہمیں دنیا سے متعلق رکھنے کے لیے دی گئی ہیں یعنی ہم میں بھوک کی جبلت ہے، جنس کی جبلت ہے، Urge to Dominate ہے، یہ ہمیں دنیا سے متعلق رکھتی ہیں۔ اگر یہ جبلتیں ہمارے اندر نہ ہوتیں تو ہم شاید اپنے آپ کو Sustain نہ کر پاتے اور اپنی نسلوں کو آگے نہ بڑھا پاتے۔ اور یہ دنیا یا تمدن کا جو سفر ہے یہ آگے نہ چل پاتا، یہ نفس کے تقاضوں کے لیے ہیں۔ اب Traditionally کیا تھا، یعنی Modernity یا Enlightenment سے پہلے focus تھا نفس کے حقوق پر، نفس کے کچھ حقوق ہیں جو اللہ پاک نے انسان میں رکھے ہیں۔ اور ہماری دینی روایات بھی یہی کہتی ہیں کہ نفس کے ان حقوق کو ادا کرو اور دنیا سے تمتع کرو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ اپنی ضرویات کو پورا کرنے کے لیے یا حقوقِ نفس کی ادائی کے

لیے جو ذرائع اور آلات و اوزار ہم نے استعمال کیے وہ اصل میں ٹیکنالوجی ہی تو تھی۔ لیکن دین یہ کہتا ہے کہ دنیا سے تمھیں جو تمتع کرنا ہے اور نفس کے حقوق ادا کرنے ہیں تو یہ تمھاری اصل حقیقت کے تابع رہنے چاہییں اور تمھاری اصل حقیقت کیا ہے وہ رب کی بندگی ہے۔ یعنی تمھیں ان چیزوں کو دنیا میں ایجاد اور دریافت کرنا ہے جو تمھاری بندگی کو Facilitate کر سکیں جو تمھاری بندگی کو آگے لے جا سکیں۔ گویا ٹیکنالوجی وہ Techne ہے جو بندے کو حقوق نفس کی ادائی میں معاون ہو اور اسے زندگی بسر کرنے میں سہولت دے تاکہ وہ سکون سے بندگی کر سکے۔ یہ ٹیکنالوجی کے بارے میں روایتی اور کلاسکل تصور تھا۔

ٹیکنالوجی کا جدید تصور

ٹیکنالوجی کا یہ جو Modern Project ہے جس کو Modernity بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے ٹیکنالوجی کے تصور کو بالکل ہی بدل دیا۔ پہلے اس نے انسان اور انسانیت کے تصور میں تبدیلی کی، نتیجہ یہ کہ ٹیکنالوجی کا تصور بھی از خود بدل گیا۔ Modernity کی جو سب سے بڑی قدر ہے وہ ہے Human Autonomy, Human Freedom, Human Liberty اور یہ باتیں ہم خود سے نہیں بنا رہے، Immanuel Kant کا ایک بہت چھوٹا سا آرٹیکل ہے، جب بھی بات ہوتی ہے کہ روشن خیالی کسے کہتے ہیں، خِردافروزی کسے کہتے ہیں، تحریکِ تنویر یا Enlightenment کسے کہتے ہیں تو کانٹ کے اسی مضمون کو بنیادی ماخذ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے پہلے پیراگراف میں کانٹ نے خود ہی بتایا ہے کہ اصل میں انسان نے اپنے اوپر ایک خود ساختہ ذہنی غلامی اور تقلید عائد کر رکھی ہے جسے وہ Immaturity یا Minority یعنی نابالغیت سے تعبیر کرتا ہے۔ اور وہ نابالغیت کیا ہے کہ انسان اپنے غیر کی رہنمائی میں زندگی بسر کرتا ہے خود سے رائے قائم نہیں کرتا۔ یعنی کہیں اس کا باپ ہے، کہیں پر اس کا استاد ہے، کہیں پر حاکم ہے اور کہیں پر مذہبی پیشوا ہے جو اس کو بتاتا ہے۔ کانٹ نے کہا کہ Enlightenment کسے کہتے ہیں کہ انسان کے اوپر جو ”Self-Incurred Tutelage“ ہے اس سے انسان نکلے اور خود سے سوچے، خود سے سمجھے، خود سے جانے اور ہر چیز کو خود طے کرے۔ اسے وہ کہتا ہے: ”Sapere Aude“

یعنی Traditional۔Dare To Use Your Own Reason or Dare To Understand آدمی دنیا کے تمام مذاہب کا چاہے وہ مذاہب Revealed ہو یا Non revealed، عیسائیت، اسلام ہو یا یہودیت، ہندومت یا بدھ مت ہو، ان سب کا جو انسان تھا بنیادی طور پر وہ "Theonomous Being" یعنی governed by God تھا، God Dependent Being تھا۔ اب خدا کا تصور مختلف ہوسکتا ہے، کہیں پر وہ personal God ہے، کہیں پر Order ہے، کہیں پر وہ abstraction ہے، کہیں پر وہ idea ہے، لیکن بہر حال خدا کا تصور تھا۔ روایت میں انسان ایک ایسا وجود تھا جو اپنے وجود میں، اپنی بقا میں ہر چیز میں خدا پر انحصار رکھتا تھا۔ لیکن اب ایک نیا آدمی پیدا ہوا جس کو کہا گیا کہ یہ "Autonomous Being" ہے یعنی governed by itself ہے۔ یہ بالکل اپنے اوپر انحصار کر سکتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ سب سے بڑی قدر اس کے اندر Self-Discrimination ہے۔ اور اپنے آپ کو خود سے تشکیل دینا، اپنے آپ کو خود سے بنانا، اپنے وجود اور شعور کی کنڈیشنگ خود سے کرنا کسی غیر کی مدد کے بغیر۔ اور خاص طور پر اس غیر کے بغیر جو Divine ہے۔ انسان As a Person اور انسان As Collectivity خود طے کر سکتا ہے کہ اس کو کیا ماننا ہے، کیا کرنا ہے، اور کیا بننا ہے۔ انسان سے اوپر کوئی اور طاقت ایسی نہیں ہے جو انسان کو یہ باتیں Dictate کرے۔ تو بہر حال یہ ہے جدید آدمی ہے۔

میں نے کہا تھا کہ ٹیکنالوجی انسان کو اس کی ضروریات پوری کرنے میں معاون چیزوں کا نام ہے تو جب انسان ہی بدل گیا تو اس کی ضروریات بھی بدل گئیں۔ جب اس کی ضروریات بدل گئیں تو ان ضروریات کو پورا کرنے والے آلات اور ٹولز بھی بدل گئے یعنی ٹیکنالوجی بھی بدل گئی تو انسان کے تصور کی تبدیلی سے ٹیکنالوجی کے تصور میں از خود تبدیلی آگئی۔ روایت میں انسان عبد تھا اور عبد کا تعلق "Techne" سے یہ تھا کہ وہ نفس کے حقوق ادا کرنے میں چیزوں کو کیسے استعمال کرے۔ لیکن جب انسان کے تصور میں تبدیلی آئی تو بات حقوقِ نفس سے آگے چلی گئی۔ اب ٹیکنالوجی حقوقِ نفس کے بجائے "حظوظِ نفس" کو پورا کرنے بلکہ "حظوظِ نفس"، نفس کی لذتوں کو maximize کرنے، زیادہ سے زیادہ بڑھانے کا نام ہے۔ یعنی اب دو پروجیکٹس ہیں مثال کے طور پر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے ذریعے کیا کرنا ہے ایک تو human emancipation,

human autonomy, human liberty and freedom اس کو maximize کرنا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ انسان کی جدید تعریف میں انسان بنیادی طور پر ایک "Pleasure seeking animal" ہے، اور ٹیکنالوجی کا ایک بڑا مقصد جس کو "Hedonism" کہا جاتا ہے یعنی (لذتوں میں غیر معمولی اضافہ کرتے چلے جانا)۔ اور کچھ لوگوں نے ایک اصطلاح استعمال کی ہے "The Hedonistic Treadmill" کے ذریعے یہ آپ کا پورا سسٹم چڑھا دیتا ہے اور آپ ساری زندگی دوڑتے رہتے ہیں اور جسے بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ جو آپ کی ضروریات ہیں وہ Satisfy ہو سکتی ہیں۔ یہ Desire ہوتی ہے اور Desire کا اختتام ایک اور Desire ہوتی ہے خواہش کبھی ختم نہیں ہوتی۔ رسول ﷺ نے فرمایا: جو آدمی حریص ہو جائے اس کے پاس اگر ایک سونے کی وادی بھری ہوئی ہو تو وہ کہے گا کہ دوسری مل جائے دوسری مل جائے تو تیسری ہو، کبھی اس کو تسکین نہیں ہوتی اور ایسے ہی آدمی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایسے آدمی کا پیٹ قبر کی مٹی سے بھرتا ہے۔

جاری ہے

*****

مولانا حماد احمد ترک

نائب مدیر ماہنامہ مفاہیم، کراچی

جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

قسط نمبر ۴

۷: محمد خان فاتح ۱۴۳۲-۱۴۸۱ء

محمد خان فاتح (جنھیں محمدِ ثانی بھی کہا جاتا ہے) کی ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق مکمل ہوئی۔ محمد خان نے اپنے زمانے کے کِبار علما سے علومِ دینیہ کی تکمیل کی، ملا خسرو، ملا کورانی، شیخ آق شمس الدین وغیرہ کی نگرانی میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ علمِ ریاضی، ہندسہ، تاریخ اور ادب میں مہارت پیدا کی۔ کم سنی میں ہی محمد خان ثانی نے عربی، فارسی، لاطینی، سربی اور یونانی زبانیں سیکھ لیں۔ محمد خان کی تربیت میں شیخ آق شمس الدین کا نمایاں کردار ہے۔ گزشتہ قسط میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ بعض بشارتوں کے پیشِ نظر محمد ثانی کے والد نے محض بارہ سال کے عمر میں ہی محمد کو تخت سونپ دیا، لیکن بوجوہ دو سال بعد دوبارہ خود تخت سنبھال لیا۔ والد کی وفات پر ۱۴۵۱ء میں محمد خان ثانی بَسُرعَتِ تمام اَدرنہ پہنچے اور تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ یوں تو فرمانِ نبوی ”لازماً قسطنطنیہ فتح ہوگا اور کیا ہی بہترین امیر ہوگا وہ امیر (جو اسے فتح کرے گا) اور کیا ہی بہترین ہوگا وہ لشکر“ کے سبب تمام ہی خلفا اور سلاطین اس بات کے خواہش مند تھے کہ قسطنطنیہ کی فتح کا سہرا ان کے سر ہو، لیکن سلطان محمد خان فاتح کو ان کے شیخ کی طرف سے بشارت ملی کہ یہ تاج تمھارے سر پر رکھا جائے گا۔ سلطان نے اوّل روز سے ہی فتحِ قسطنطنیہ کی تیاریاں شروع کردیں۔ سلطان جانتے تھے کہ قسطنطنیہ کی فتح میں دو بڑی رکاوٹیں ہیں جنھیں دور کیے بغیر چارہ نہیں: ایک قسطنطنیہ کے دفاعی اور حفاظتی انتظامات اور اس کا محلِ

وقوع، اور دوسرا بیرونی مداخلت اور حملے کا خطرہ۔ سلطان نے سپاہیوں کی تعداد، آلاتِ حرب وضرب کی فراوانی، نقشوں کی تیاری اور بالخصوص جدید طرز کی توپوں کی صنعت گری پر خصوصی توجہ دی۔ ایک غیر ملکی انجینیر کے ذریعے بہت بڑی توپ تیار کی گئی جسے ''شاہی توپ'' کا نام دیا گیا۔ اسی طرح باسفورس کے کنارے قسطنطنیہ سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر یورپی ساحل سے متّصل ایک عظیم الشان قلعے کی تعمیر شروع ہوگئی، ایسا ہی ایک قلعہ اس کے بالمقابل ایشیائی ساحل پر سلطان بایزید بنا چکے تھے۔ اس قلعے کی تعمیر رکوانے کے لیے قسطنطین نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، لیکن سلطان نے قلعے کی تعمیر مکمل کرلی۔ اب آبنائے باسفورس مکمل ترکوں کے قبضے میں تھی، قلعے پر توپیں نصب تھیں، جو کسی بھی بحری جہاز کو نشانہ بنا سکتی تھیں۔ یہ انتظامات تو قسطنطنیہ کے مضبوط دفاعی نظام کے سبب تھے، بیرونی امداد اور مداخلت سے بچنے کے لیے سلطان نے سب سے پہلے امیرِ کرمانیہ سے صلح کی تاکہ پشت سے حملے کا خطرہ ٹل جائے۔ پھر عظیم جرنیل ہونیاڈے (جس کا ذکر پچھلی قسط میں گزر چکا ہے) سے تین سال کے لیے صلح کرلی۔ اس کے بعد شاہ قسطنطین کے بھائیوں کی جانب سے متوقع امداد کے پیشِ نظر موریا کی طرف فوج روانہ کی۔ مذکورہ تدابیر سے فارغ ہونے کے بعد سلطان قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ سلطان کو بحری فوج میں خصوصی دلچسپی تھی، چنانچہ ایک سواسّی جہازوں پر مشتمل بحری بیڑہ بھی سلطان نے اپنی نگرانی میں تیار کروایا۔ ادرنہ میں موجود ڈیڑھ لاکھ سپاہیوں اور دیگر جنگی سازوسامان کے ساتھ سلطان نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ محاصرے کی تفصیل سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ قسطنطنیہ شہر کا محلِ وقوع کیسا تھا اور کیوں یہ شہر ہمیشہ سے ناقابلِ تسخیر رہا:

قسطنطنیہ مثلث نما شہر تھا جس کے تین طرف پانی تھا؛ ایک جانب بحرِ مرمرا، دوسری جانب باسفورس جبکہ تیسری طرف شاخ زرّیں جسے گولڈن ہارن بھی کہتے ہیں موجود تھی۔ باسفورس سے گولڈن ہارن جانے والے راستے میں ایک بہت بڑی اور مضبوط زنجیر لگائی گئی تھی جس کے سبب قسطنطنیہ میں داخلہ ناممکن تھا۔ اس شہر کا وہ حصہ جو پانی کے ساتھ تھا یعنی بحرِ مرمرا سے لے کر شاخ زرّیں تک، اس کی حفاظت کے لیے دو بہت مضبوط فصیلیں تھیں، دونوں فصیلوں کے مابین ساٹھ فٹ کا فاصلہ تھا اور درمیان میں ایک نہر بھی تھی۔ باہر والی فصیل پچیس فٹ بلند تھی اور اس پر برج بنے ہوئے تھے جہاں سپاہیوں کی بھاری تعداد موجود ہوتی۔

بالفرض کوئی فصیل عبور کر بھی لیتا تو آگے نہر تھی، نہر پار کرنے پر ایک چالیس فٹ کی فصیل موجود تھی جو شہر سے متّصل تھی، اس چالیس فٹ کی فصیل پر بہت بلند برج تھے جن کی اونچائی ساتھ فٹ کے لگ بھگ تھی۔ اسے پار کرنا بلندی کے اعتبار سے بھی مشکل تھا اور سپاہیوں کے حملوں کے اعتبار سے بھی۔ کیونکہ پہلی فصیل پار کرنے کے بعد نہر میں اُترنا پڑتا اور وہاں پر مامور سپاہی، حملہ آوروں کو نشانہ بنا کر ختم کر دیتے۔ لہذا اوّل تو ایسی کوشش ہوئی ہی نہیں اور جب کسی نے کی تو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرا حصہ جہاں سے شہر میں داخلہ ممکن تھا وہ گولڈن ہارن تھی، لیکن وہاں ایک بہت مضبوط زنجیر لگائی گئی تھی، اگر کوئی زنجیر کے قریب بھی آتا تو چوکیوں میں موجود سپاہی اسے تیروں کی بارش میں واپس بھاگنے پر مجبور کر دیتے، چنانچہ یہاں سے بھی داخل ہونا ممکن نہ تھا۔ اب رہی بات اس حصّے کی جو خشکی پر تھا تو اس کی حفاظت کے لیے تین فصیلیں موجود تھیں، پہلی فصیل شہر سے متّصل تھی، اس سے ساٹھ فٹ کے فاصلے پر دوسری فصیل تھی اور تیسری فصیل باہر تھی جہاں عثمانی فوجیں محاصرہ کیے ہوئی تھیں۔ دوسری اور تیسری فصیل کے درمیان ساٹھ فٹ چوڑی اور 'سو' فٹ گہری خندق تھی جسے عبور کرنا بہت مشکل تھا۔ فصیلوں پر برج بنے ہوئے تھے جہاں بازنطینی سپاہی ہمہ وقت انتہائی جوش و جذبے سے دفاع کے لیے تیار رہتے تھے۔ جو حملہ ہوتا تھا وہ تیسری فصیل پر ہوتا تھا جس سے شہر پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اور یہ فصیلیں اتنی مضبوط تھیں کہ عام توپوں سے ان کا کچھ نہ بگڑتا اور کہیں کوئی رَخنہ پڑ ہی جاتا تو بازنطینی دفاعی نظام اتنا شاندار تھا کہ اسے فوراً ابھر دیا جاتا اور جب تک توپیں خاموش ہوتیں اور سپاہی فصیل کے نزدیک آتے وہ شگاف بند ہو چکا ہوتا۔ گولہ باری کے دوران ظاہر ہے کہ سپاہی پیچھے آجاتے تھے اور شگاف پڑنے پر ہی فصیل کے نزدیک جا سکتے تھے۔ قسطنطنیہ کا صرف ایک حصّہ ایسا تھا جہاں سپاہی کثیر تعداد میں نہیں تھے اور وہ شاخِ زرّیں کا حصّہ تھا۔ محاصرہ اب بھی نامکمل تھا کیونکہ شاخِ زرّیں بازنطینیوں کے پاس تھی اور شاخِ زرّیں میں جانے کے لیے زنجیر سے گزرنا ضروری تھا۔ اب آپ جان گئے ہوں گے کہ یہ قلعہ کیوں ناقابلِ تسخیر تھا اور کیسے اب تک اکیس حملوں میں اس شہر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، اور اس کو فتح کرنے کی حسرت لیے کتنے بادشاہ دنیا سے کوچ کر گئے۔ آئیے اب دیکھتے ہیں کہ سلطان محمد خان فاتح نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی۔

سلطان محمد فاتح نے حملوں کا آغاز خشکی والے حصّے سے کیا اور توپوں سے مسلسل گولے برسانے شروع کردیے، خاص طور پر شاہی توپ کا بھرپور استعمال کیا حتی کہ ایک موقعے پر شاہی توپ کثرت استعمال ہونے کی وجہ سے ایک جگہ سے پھٹ گئی، تو اس کی مرمت کی گئی اور توپوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے تیل کا استعمال کیا گیا۔ اس خوف ناک محاصرے کو ختم کرنے کے لیے قسطنطین نے مال و دولت اور بہت سے خِطوں کی ملکیت کی پیشکش کی، لیکن سلطان نے صاف انکار کردیا۔ سلطان نے اس پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے یہ تاریخی جواب دیا: "یا تو میں قسطنطنیہ لے لوں گا یا قسطنطنیہ مجھے لے لے گا"۔ شاہ قسطنطین نے شہر کے دفاع کے لیے بھرپور تیاری کی، سپاہیوں کو حوصلہ دلانے کے لیے دن بھر مذہبی رہنما فصیلوں کا چکر لگاتے اور وعظ کہتے۔ اس کے ساتھ ساتھ قسطنطین جو کہ آرتھوڈاکس عیسائیت کا علم بردار اور رہنما تھا، اس نے مدد کے لیے پاپائے اعظم اور دیگر ممالک بالخصوص یورپ کے بادشاہوں کو پیغام بھیجے۔ قسطنطین نے اعلان کیا کہ وہ آرتھوڈاکس کلیسا کو کیتھولک کلیسا کے ساتھ ضم کردے گا اور پوپ کا مطیع بنادے گا، اس پر پوپ نے مدد کا اقرار کیا۔ لیکن آرتھوڈاکس فرقے کے عیسائی اور پادری قسطنطین کے مخالف ہوگئے۔ قسطنطین کے فیصلے کے بعد کارڈینل کے زیرِ صدارت ایک مجلسِ مشاورت منعقد ہوئی جس میں اتفاقِ رائے سے یونانی کلیسا کو رومی کلیسا میں ضم کردیا گیا۔ دونوں فرقوں میں طویل عرصے کی مخاصمت چلی آرہی تھی چنانچہ یونانی پادریوں نے اس پر شدید غم وغصّے کا اظہار کیا اور بہت سے عہدے دار قسطنطین کا ساتھ چھوڑ گئے۔ افواجِ قسطنطنیہ کے سپہ سالار نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "مجھے کارڈینل کی ٹوپی کے مقابلے میں قسطنطنیہ میں ترکوں کے عمامے زیادہ گوارا ہیں"۔ چنانچہ کلیساؤں نے بادشاہ کو مدد دینے سے انکار کردیا۔ دوسری طرف یورپ بارہا ترکوں سے بدترین شکست کھاچکا تھا، لہذا سابقہ تجربات کی روشنی میں قسطنطین کی مدد پر کوئی آمادہ نہیں ہوا اور یورپی ممالک نے اس موقعے پر جس سرد مہری کا مظاہرہ کیا ناقابلِ بیان ہے۔ بہت معمولی سی مدد قسطنطین کو میسر آئی، البتہ امدادی ساز وسامان پر مشتمل ایک قابلِ ذکر قافلہ اہلِ جنیوا نے ارسال کیا، ان کے مشہور کمانڈر جان جسٹینانی کی قیادت میں دو جنگی جہاز اور سات سو منتخب سپاہی قسطنطنیہ کی مدد کو پہنچ گئے۔ جنیوا سے آیا ہوا کمانڈر غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل تھا اور اپنی ذات میں ایک فوج شمار ہوتا تھا۔ اس کی آمد سے بازنطینی افواج کو بہت حوصلہ ہوا اور قسطنطنیہ کی حفاظت کی ذمے داری جسٹینانی

کے کاندھوں پر آگئی۔ اس بہادر کماندار نے ایسی مہارت سے عثمانی افواج کا مقابلہ کیا کہ محمد فاتح خود اس کی مدح سرائی کرنے لگا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ سلطان محمد فاتح کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ کاش یہ میری فوج کا کمانداد ہوتا۔ بہرحال، عثمانی افواج نے طرح طرح سے فصیل عبور کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ سلطان نے ایک انوکھا کام یہ بھی کیا کہ لکڑیوں کا ایک متحرک قلعہ تیار کیا جو بہت بلند تھا اور بہت سارے سپاہی اس میں سوار ہوئے، پھر اس کو فصیل کے قریب لے جایا گیا۔ کچھ دیر تو یہ ترتیب کامیاب رہی اور عثمانی سپاہی فصیل پر چڑھنے میں کامیاب بھی ہوئے لیکن بازنطینی سپاہیوں نے انھیں آگے بڑھنے نہ دیا، بلکہ اس متحرک قلعے کو آگ لگادی۔ اسی دوران ایک مشہور بحری معرکہ پیش آیا، یوں تو فرانس، ہنگری، جرمنی اور پولینڈ جیسی عظیم یورپی ریاستوں نے انتہائی بے حِسی کا مظاہرہ کیا اور قسطنطنیہ کو عثمانیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، لیکن یونان اور جنیوا کے جہاز امدادی سامان لے کر بحرِ مرمرا سے باسفورس تک آگئے۔ امداد کے لیے انھیں زنجیر عبور کرکے گولڈن ہارن میں داخل ہونا تھا، لیکن راستے میں عثمانی کشتیاں حائل تھیں۔ دونوں میں مقابلہ ہوا، لیکن جنیوا کے جہاز عثمانی کشتیوں سے بڑے تھے، ان کی گولہ باری سے عثمانی کشتیاں منتشر ہوگئیں۔ امیرالبحر باوجود بھرپور کوشش کے انھیں روکنے میں ناکام رہا۔ سلطان خشکی سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، عثمانی کشتیوں کی پسپائی نے سلطان کو بے قابو کر دیا اور وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا سمندر میں اتر گیا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ رسد کو قسطنطنیہ میں داخل ہوتا دیکھ کر سلطان کی حالت دیدنی تھی، بے چینی سے دائیں بائیں گھوڑا دوڑاتے ہوئے وہ اتنی دور سے امیرالبحر کو پکار پکار کر ہدایات دے رہا تھا۔ اس معرکے میں شکست پر سلطان نے امیرالبحر کو معزول کر دیا۔ اس دوران خشکی سے مسلسل حملے ہوتے رہے اور سلطان محمد فاتح قسطنطین کو پیغام ارسال کرتا رہا کہ شہر میرے حوالے کر دو تو تمام شہری محفوظ رہیں گے اور کوئی نقصان نہیں ہوگا، لیکن بادشاہ نے شدت کے ساتھ انکار کر دیا۔ اب تک توپوں کی گولہ باری سے فصیل کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس مشکل موقعے پر سلطان نے ایسی تجویز پیش کی کہ آج تک انسانی عقل حیران ہے، اسے الہامی تجویز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ سلطان نے یہ جان لیا کہ زنجیر کے باہر پانی گہرا ہے جہاں ترکی بیڑے کی کامیابی ممکن نہیں، بازنطینی جہاز وہاں فولاد کی طرح جمے ہوئے ہیں، عثمانی بحریہ زنجیر توڑنے کی متعدّد کوششیں کر چکی تھی لیکن ہر بار ناکامی ہوئی تھی۔ آخری حل یہی تھا کہ کسی طرح کشتیوں کو گولڈن ہارن میں اتار دیا جائے تو وہاں

پانی کم ہے اور بازنطینی جہازوں کے لیے آمد و رفت مشکل ہے، اسی طرح اس مقام پر نسبتاً تھوڑے سپاہی تعینات تھے کیونکہ زنجیر سے اس طرف کشتیوں کا آنا، ناممکن تھا۔ چنانچہ سلطان نے راتوں رات ایک ٹیلے پر چربی اور تیل ملی ہوئی لکڑیاں بچھائیں اور تقریباً اسی کشتیاں گھوڑوں کے ذریعے خشکی پر چلا کر شاخِ زرّیں میں زنجیر کے پار اُتار دیں۔ یہ کام اس قدر حیرت انگیز تھا کہ بازنطینی افواج کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اس خبر نے شہر میں مایوسی پھیلا دی اور ترکوں کے بارے میں قسطنطنیہ میں افواہیں گردش کرنے لگیں۔

قسطنطنیہ کا باقاعدہ محاصرہ ۶/اپریل ۱۴۵۳ء کو شروع ہوا تھا۔ تقریباً ۵۳ دنوں کے شدید مقابلے کے بعد ۲۸ مئی کو سلطان نے اندازہ لگایا کہ اب قسطنطنیہ میں مزید سکت نہیں رہی، تو سلطان نے بہت قریب سے فصیلوں کا مشاہدہ کیا اور اگلے دن یعنی ۲۹ مئی کو آخری حملے کا اعلان کیا۔ سلطان جس رستے سے گزرتا، انھیں جہاد کی آیات سناتا اور انھیں یقین دلاتا کہ کل ہمیں ضرور فتح ملے گی۔ سلطان کے حکم پر یہ رات پورے لشکر نے عبادات و مناجات میں گزاری۔ سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور دیگر مجاہدین و شہدا کے تذکرے ہوتے رہے۔ اس دن سلطان نے تین اہم کام کیے: قرب و جوار کی ریاستوں کو غیر جانب دار رہنے کے لیے خطوط ارسال کیے۔ اوّل اوّل شہر میں داخل ہونے والے سپاہیوں کے لیے خصوصی انعام کا اعلان کیا۔ اور بری اور بحری دونوں افواج کو آخری حملے کی اطلاع کے ساتھ یہ ہدایات دیں کہ عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کیا جائے گا، مقدسات پر حملہ نہیں کیا جائے گا اور قتلِ عام سے اجتناب کیا جائے گا۔

محاصرے کے آخری دن تین واقعات ایسے ہوئے جو عثمانی افواج کے شہر کے داخلے میں معاون ثابت ہوئے۔ اولاً شاخِ زرّیں میں عثمانی غالب آنے لگے تو خشکی سے فوج کا ایک حصّہ یہاں منتقل کیا گیا، چنانچہ خشکی والی عثمانی افواج کے حملوں میں شدت آگئی۔ دوسرے، خشکی کی جانب دفاع کرتے ہوئے کمانڈر جسٹینانی کو ایک کاری وار لگا جس سے وہ جنگ سے دست بردار ہو گیا اور فوج میں مایوسی پھیل گئی۔ تیسرا واقعہ یہ ہوا کہ بازنطینی اپنے بادشاہ قسطنطین سے محروم ہو گئے جس کی تفصیل آگے ذکر کی جائے گی۔ بہر حال، اس صورتِ حال میں عثمانی سپاہیوں کا پلہ بھاری ہو گیا، پے در پے حملوں سے بعض جگہ شگاف پڑ چکے تھے اور فصیل پر بازنطینی سپاہیوں کی تعداد کم ہو چکی تھی، اس کے باوجود قلعے میں داخلے کی ہر تدبیر الٹا دی گئی۔ ۲۹ مئی

کی صبح سلطان نے لشکر کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا اور یہ حکم دیا کہ اگر ایک حصہ تھک جائے تو تازہ دم سپاہ پر مشتمل دوسرا گروہ میدان سنبھال لے۔ ابتدائی طور پر جو بھی عثمانی سپاہی داخل ہوا اسے فوراً شہید کر دیا گیا، لیکن اسی دوران ایک سپاہی نے فصیل پر عثمانی پرچم لہرا دیا۔ سلطان کے لشکر کے کئی حصّے میدان سے پیچھے تھے۔ جب ایک حصّہ تھک جاتا تو نیا اور تازہ دم لشکر بازنطینی سپاہیوں پر ٹوٹ پڑتا، ان کے حوصلے پست تھے، اور مسلسل لڑتے لڑتے تھک چکے تھے، نیز انھیں ہر محاذ پر تازہ دم اور جرأت وجذبے سے بھرپور فوج کا سامنا تھا، اس کے باوجود ''مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا''۔ بازنطینی سپاہی بہت بے جگری سے لڑے اور انھوں نے کلیسا سے وفاداری کا حق ادا کر دیا۔ انہی حملوں کے دوران جسٹینانی نے زخم کھایا اور راہِ فرار اختیار کی۔ عثمانیوں کی ان کامیابیوں کے پیشِ نظر قسطنطین کو تجویز دی گئی کہ وہ شہر چھوڑ دے اور یورپ جاکر مدد طلب کرے، لیکن قسطنطین نے منظور نہیں کیا، آیا صوفیا میں داخل ہو کر عبادت اور دعا کی، اہلِ خانہ اور وزرا سے الوداعی ملاقات کی اور پھر لشکر (جو جسٹینانی کے جانے سے ناامید ہو گیا تھا) کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی اور ایک سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مارا گیا۔ قسطنطین نے فرار ہونے پر لڑتے ہوئے جان دینے کو ترجیح دی۔ عثمانی حملوں میں شدت آتی گئی۔ کچھ دیر بعد سلطان نے سپاہیوں کو پیچھے بلایا۔ بازنطینی سمجھے کہ عثمانی آرام کی غرض سے پیچھے ہوئے ہیں، لیکن اسی دوران توپوں نے شعلے برسانے شروع کر دیے، ایک بار پھر عثمانیوں کو متعدّد سیڑھیوں کے ساتھ فصیل کی طرف بھیجا گیا لیکن اس مشکل وقت میں بھی بازنطینی سپاہ کی جرات بے مثال تھی۔ دوپہر تک ایک عثمانی سپاہی بھی شہر کے اندر داخل نہ ہو سکا۔ دوپہر کے قریب سلطان کے ذاتی محافظ دستے 'ینی چری' کے نوجوان ایک زور دار حملے کے ساتھ شہر میں داخل ہو گئے، اگرچہ ابتدائی داخل ہونے والے بہت سے سپاہی شہید ہو گئے لیکن وہ اپنا علم فصیل پر لہرانے میں کامیاب ہو گئے۔ بس پھر تو عثمانی سپاہی سیلاب کی مانند شہر میں داخل ہوتے چلے گئے۔ شام کے قریب سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ میں داخل ہوئے اور آیا صوفیا پہنچ کر اذان کا حکم دیا۔ سلطان نے عام معافی کا اعلان کیا اور پادریوں سے ملاقات کر کے انھیں اطمینان دلایا کہ وہ اپنے عہدوں پر اسی شان سے رہ سکتے ہیں، اپنی عدالت قائم کر سکتے ہیں، انھیں اپنے مذہب پر عمل کی مکمل اجازت ہے۔ اس اعلان سے بہت سے لوگ جو پہلے شہر چھوڑ چکے تھے وہ بھی واپس

آ گئے۔ سلطان نے آیا صوفیا کو مسجد میں تبدیل کیا۔ قسطنطنیہ کو دار الخلافہ قرار دیا اور سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر پر حاضری دے کر وہاں مسجد اور مزار تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ سلطان جب شاہی محل پہنچے اور اس کی ویرانی اور بے رونقی پر نظر ڈالی تو بے اختیار یہ شعر ان کی زبان پر جاری ہو گیا:

پردہ داری می کند بر قصرِ کسریٰ عنکبوت چُغد می نوبت زند بر گنبدِ افراسیاب

کسریٰ کے محل پر مکڑی پردہ ڈال رہی ہے اور افراسیاب (توران کے ظالم بادشاہ) کے گنبد پر الو نوبت بجا رہا ہے۔

سلطان نے قسطنطنیہ میں اسپتال، مدرسے، مساجد، مہمان خانے اور بازار قائم کیے اور اس حسین شہر کے حسن کو چار چاند لگا دیے۔ قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کا مشہور گرینڈ بازار سلطان محمد خان فاتح کا قائم کردہ ہے۔ سلطان نے قسطنطنیہ محض اکیس سال کی عمر میں فتح کیا۔ فتح کے بعد سلطان محمد خان کو **فاتح** کا لقب دیا گیا۔

سلطان نے محض قسطنطنیہ کی فتح پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ یونان، سرویا، بوسنیا، موریا، کرمانیہ، طرابزون اور سینوپ جیسے اہم ممالک فتح کیے اور عثمانی سلطنت کو وسعت دی۔ سلطان نے وینس کے زیرِ تسلط بہت سے جزائر بھی فتح کیے۔ سلطان کا ایک اور بڑا کارنامہ کریمیا کی فتح ہے، ”کافہ“ شہر اپنی طاقت اور محلِ وُقوع کے اعتبار سے قسطنطنیہ کوچک (چھوٹا قسطنطنیہ) کہلاتا تھا۔ پہلے اس پر حملہ کیا گیا، اس حملے میں باقاعدہ بحری بیڑے کو استعمال کیا گیا اور چالیس ہزار فوج کے ساتھ کافہ اور پھر مکمل کریمیا سلطنتِ عثمانیہ کے زیرِ نگیں آ گیا۔ ایک اہم کارنامہ ولاچیا کی فتح ہے، جنگِ کوسوَہ کے بعد ولاچیا عثمانیوں کے تابع تھا لیکن وِلاد چہارم نے بغاوت کر دی اور عثمانی تاجروں کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ یہ شخص حد درجے ظالم تھا اور غیر ملکی ہی نہیں اس کے اپنے شہری بھی اس کے مظالم سے تنگ تھے۔ اسے تعذیب کے نت نئے انداز سوجھتے تھے، انسانوں کے جسموں میں میخیں ٹھونک کر قتل کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اسے ”ڈراکول“ یعنی شیطان کا لقب دیا گیا تھا۔ سلطان نے اسے تنبیہ کی لیکن باز نہ آیا اور عثمانی علاقوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ بلغاریہ سے پچیس ہزار عثمانی شہری گرفتار کیے اور سب کو قتل کر دیا۔ سلطان نے ایک وفد اس کے پاس بھیجا کہ گرفتار شدہ گان کا حال معلوم ہو، لیکن اس نے شاہی وفد کے سروں میں کیل ٹھونک کر انھیں ہلاک کر دیا۔ اب محمد خان فاتح کے لیے ولاچیا پر لشکر کشی لازم ہو گئی، چنانچہ سلطان بذاتِ خود ڈیڑھ لاکھ کے لشکرِ جرار کے ساتھ حملہ آور ہوا،

ولاد نے راہِ فرار اختیار کی اور ولاچیا سلطان کے تسلط میں آگیا۔ اس کے بعد البانیہ اور ہرزیگووینا پر عثمانی افواج نے قبضہ کیا۔ سلطان کا اگلا ہدف وینس تھا اور یہ بہت بڑا ہدف تھا۔ عثمانیوں کی یہ جنگ تقریباً سولہ سال جاری رہی اور بالآخر شاہِ وینس صلح پر آمادہ ہوگیا۔ اس کے بعد عثمانی افواج اٹلی کے دروازے یعنی اوٹرانٹو میں داخل ہوئیں، یہ جنگ بھی عثمانیوں کے لیے بہت صبر آزما تھی۔ بحری اور بری دونوں افواج کے زبردست حملوں کے نتیجے میں ۱۴۸۰ء میں اوٹرانٹو بھی فتح ہوگیا۔ ابھی سلطان کے پیشِ نظر کوئی نیا محاذ تھا اور افواج کو تیار کیا جارہا تھا کہ سلطان کو زہر دے دیا گیا۔ سلطان محمد خان فاتح اکیاون سال کی عمر میں ۱۴۸۱ء میں شہید ہوئے اور اسی مسجد میں دفن ہوئے جو انھوں نے خود قسطنطنیہ میں بنوائی تھی۔ یہ مسجد سلطان محمد خان فاتح کے نام سے منسوب ہے۔ سلطان کی کامیابی کا راز ان کی للّٰہیت اور شاندار جنگی حکمتِ عملی تھی۔ سلطان کی خوبی تھی کہ وہ اپنے منصوبے کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے، ان کا ایک جملہ نقل کیا جاتا ہے: ”اگر مجھے پتا چل جائے کہ میری داڑھی کا ایک بھی بال میرے منصوبے سے واقف ہوگیا ہے تو میں اسے اکھاڑ پھینکوں“۔ سلطان علم دوست اور ادب پرور شخص تھے۔ سلطان ایک عمدہ شاعر تھے اور ”عونی“ تخلص کرتے تھے۔ سلطان نے ۲۴ مدارس، ۱۲ کاروان سرائے، ۴۰ پانی کی سبیلیں؛ استنبول، بورصا، ادرنہ اور دیگر شہروں میں قائم کیں۔ متعدّد فلاحی اور عسکری ادارے قائم کیے، مسجد ایوب سلطان، مسجد سلطان محمد فاتح، قصرِ قدیم جو آج استنبول یونی ورسٹی کہلاتی ہے، قصرِ توپ کاپی جہاں آج میوزیم قائم ہے، یہ تمام عمارات سلطان کی قائم کردہ ہیں۔ قصرِ توپ کاپی ”شاہی توپ“ کی یادگار بھی ہے کیونکہ محاصرے کے دوران شاہی توپ عین اس مقام کی سیدھ میں تھی جہاں آج توپ کاپی واقع ہے۔

جاری ہے

کتابیات

السلاطين العثمانيون، راشد كوندوغدو، الناشر: دار الرموز للنشر، إسطنبول، ۲۰۱۸ء

آلبوم پادشاہانِ عثمانی، مترجم: میلاد سلمانی، ناشر: انتشاراتِ قَقنُوس، استنبول، ۲۰۱۵ء

تاریخِ سلطنتِ عثمانیہ، ڈاکٹر محمد عزیر، ناشر: کتاب میلہ، ۲۰۱۸ء

سلطنتِ عثمانیہ، ڈاکٹر علی محمد الصلابی، مترجم: علامہ محمد ظفر اقبال، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، جون ۲۰۲۰ء

*****

قسطنطنیہ کا قدیم نقشہ جس میں ہم نے فتح سے متعلق مقامات کی نشاندہی کی ہے۔ نشاندہی محتاط اندازے کے مطابق ہے۔ پرانا نقشہ ہے اس لیے مقامات کا بعینہ تعین مشکل تھا۔

1) شاخِ زرّیں یا گولڈن ہارن

2) باسفورس

3) بحرِ مرمرہ

4) وہ ٹیلہ جہاں سے سلطان نے کشتیاں گزاریں

5) عثمانی لشکر اور شاہی توپ

6) بازنطینی لشکر

7) یورپی ساحل، جس کے قریب سلطان نے قلعہ بنایا

8) آیا صوفیا اور توپ کاپی

9) اس کے قریب سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار ہے

10) فاتح رحمۃ اللہ علیہ کا مزار اور مسجد

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

رمضان کی تیاری شعبان میں کریں

شعبان المعظم رمضان المبارک کے انتظار اور اس کی تیاری کا مہینا ہے۔ یہ مہینا رمضان کی سیڑھی اور اس تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ جس کا شعبان اچھا ہوا تو امید ہے کہ اس کا رمضان بھی اچھا گزرے گا۔ نبی کریم ﷺ رجب اور شعبان کے مہینے ہی سے جو دعا پڑھا کرتے تھے وہ بھی رمضان کے انتظار اور اس کے لیے تیاری کا مظہر ہے: «اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي رَجَبٍ وَشَعْبَانَ وَبَلِّغْنَا رَمَضَانَ» (مرقاۃ المفاتیح) "اے اللہ ہمیں رجب اور شعبان میں برکت دے اور ہمیں رمضان تک پہنچا دے"۔ شارحین نے یہاں برکت سے کثرت عبادت مراد لی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کی عبادتوں سے پہلے شعبان ہی میں کچھ عبادت شروع کر دینی چاہیے کہ یہ ہمیں رمضان کی عبادت کے لیے تیار کر دے گی۔

شعبان کی عبادت میں سب سے اہم شے نفلی روزوں کا اہتمام ہے۔ نبی کریم ﷺ سے جب افضل روزوں کی بابت سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: «شَعْبَانُ لِتَعْظِيمِ رَمَضَانَ» "ماہِ شعبان (کے روزے) رمضان کی تعظیم کرتے ہوئے"۔ تعظیم کی وضاحت کرتے ہوئے شارحین فرماتے ہیں: انسان رمضان میں کچھ روزے رکھے تاکہ اس کا نفس روزے کا عادی ہو جائے، اس طرح ہے امید کہ رمضان کے روزے اس پر گراں نہ گزریں گے اور اس کو ناپسند نہ ہوں گے"۔ (تحفۃ الاحوذی) اللہ تعالیٰ نے فرض نمازوں سے پہلے ہم کچھ نفل یا سنت مشروع کیے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان نمازوں کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جب انسان کاروبار دنیا میں مشغول رہتا ہے اور جب نماز کے لیے آتا ہے تو دنیا کے اثرات

اس پر چھائے رہتے ہیں۔فرض سے پہلے والی نفل عبادت مصروفیتِ دنیا کے اثرات میں کمی لاتی ہے۔اس طرح فرض عبادات،ان کے آداب کے ساتھ ادا کرنا ہمارے لیے آسان ہو جاتا ہے اور اس میں ہمیں خشوع وخضوع حاصل ہوتا ہے"۔بالکل یہی حکمت شعبان کی عبادات کے لیے ہے جو ہمیں رمضان کے لیے تیار کرتی ہے۔نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا:"یارسول اللہ کیا وجہ ہے کہ آپ کسی مہینے میں اتنے روزے نہیں رکھتے جتنے کہ شعبان میں رکھتے ہیں تو فرمایا:«ذَلِكَ شَهْرٌ يَغْفُلُ النَّاسُ عَنْهُ بَيْنَ رَجَبٍ وَرَمَضَانَ، وَهُوَ شَهْرٌ تُرْفَعُ فِيهِ الْأَعْمَالُ إِلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ فَأُحِبُّ أَنْ يُرْفَعَ عَمَلِي وَأَنَا صَائِمٌ»(سننِ نسائی) "رجب اور رمضان کے درمیان یہ ایک ایسا مہینا ہے جس سے اکثر لوگ غافل ہوتے ہیں اور یہ ایسا مہینا ہے جس میں اعمال رب العالمین کی طرف بلند ہوتے ہیں پس میں پسند کرتا ہوں کہ میرا عمل بلند ہو اور میں روزے سے ہوں"۔

ماہِ شعبان کا ایک خاص عمل نصفِ شعبان کی رات یعنی چودھویں سے اگلی، پندرھویں رات کو زندہ کرنا ہے،اسے شبِ براءَت بھی کہا جاتا ہے۔امام شافعی نے الرسالہ میں اس رات کی فضیلت نقل کی ہے۔درج ذیل صحیح روایت سے نصفِ شعبان کی رات میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا ظہور پذیر ہونا معلوم ہوتا ہے:«إِنَّ اللهَ لَيَطَّلِعُ فِي لَيْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَيَغْفِرُ لِجَمِيعِ خَلْقِهِ إِلَّا لِمُشْرِكٍ أَوْ مُشَاحِنٍ»(سلسلة الأحاديث الصحيحة) "بے شک اللہ تعالیٰ نصفِ شعبان کی رات اپنی مخلوق کی طرف نزول فرماتا ہے پھر تمام مخلوقات کو معاف فرما دیتا ہے سوائے مشرک اور باہمی بغض رکھنے والوں کے"۔

ایک روایت میں آتا ہے:«إِنَّ اللهَ تَعَالَى يَنْزِلُ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَغْفِرُ لِأَكْثَرَ مِنْ عَدَدِ شَعْرِ غَنَمِ كَلْبٍ»(سننِ ترمذی) "بے شک اللہ تعالیٰ نصفِ شعبان کی رات، سماے دنیا پر نزول فرماتے ہیں پھر بنو کلب کی بکریوں کے بالوں کی تعداد سے زیادہ لوگوں کی بخشش فرما دیتے ہیں"۔کوشش کرنی چاہیے کہ شب براءت کو نہ صرف عبادت کا اہتمام کیا جائے بلکہ اسے رمضانی عبادات کے لیے ایک بریک تھرو سمجھا جائے۔

اعمالِ رمضانی کی نیت

ماہِ شعبان میں کرنے کا ایک اہم کام اعمالِ رمضان کی نیت ہے۔ایک روایت میں آتا ہے:«نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ»(المعجم الکبیر)'' مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہوتی ہے''۔یعنی مومن ہمیشہ اچھے سے اچھے اور زیادہ سے زیادہ عمل کی نیت و ارادہ رکھتا ہے یہ الگ بات کہ عمل کرتے وقت کسی کمی کوتاہی کا شکار ہو جائے لیکن نیت اس کی ہمیشہ اچھی ہوتی ہے اور اسی کے مطابق وہ اجر بھی پاتا ہے۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا:«مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كُتِبَتْ لَهُ حَسَنَةً»(صحیح مسلم)''جو کوئی نیکی کا ارادہ کرے لیکن نیکی کر نہ سکے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی جائے گی''۔نبی کریم ﷺ نے رمضان کے بارے میں فرمایا:«إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ لَيَكْتُبُ أَجْرَهُ وَنَوَافِلَهُ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُدْخِلَهُ» (مسندِ احمد)''اللہ تعالیٰ مومن کا اجر اور اس کے نوافل رمضان کے داخل ہونے سے پہلے ہی لکھ دیتا ہے''۔تو رمضان سے پہلے ہی اعمال رمضان کی نیت بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان امور کی منصوبہ بندی کر لینی چاہیے۔یاد دہانی کی غرض سے ہم کچھ اعمال کا مختصر ذکر کرتے ہیں۔

روزہ

ماہِ رمضان کا سب سے بڑا فرض اس کے روزے رکھنا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (البقرۃ:۱۸۳)''اے لوگو!تم پر رمضان کے روزے فرض قرار دیے گئے''۔رسول اللہ ﷺ نے اس کی فرضیت کا حکم سناتے ہوئے فرمایا:«قَدْ جَاءَكُمْ رَمَضَانُ، شَهْرٌ مُبَارَكٌ، افْتَرَضَ اللهُ عَلَيْكُمْ صِيَامَهُ»(مسندِ احمد)''اے لوگو!رمضان کا مہینا آ گیا۔یہ ماہِ مبارک ہے۔اللہ نے تم پر اس مہینے کے روزے رکھنا فرض قرار دیا ہے''۔روزہ بخشش و مغفرت کا ذریعہ ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ» (متفق علیہ)'' جس نے رَمَضان کے روزے ایمان و اخلاص سے رکھے اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں''۔

ایک روایت میں آتا ہے:«مَا مِنْ عَبْدٍ يَصُومُ يَوْمًا فِي سَبِيلِ اللهِ إِلاَّ بَاعَدَ اللهُ بِذَلِكَ اليَوْمِ وَجْهَهُ عَنِ النَّارِ سَبْعِينَ خَرِيفًا» (متفق علیہ) "جو بندہ مسلمان اللہ کی رضا کے لیے ایک دن کا روزہ رکھے اس کی برکت سے اللہ اسے دوزخ سے ستر سال کے فاصلے جتنا دور کر دے گا"۔

روزے کے آداب وحدود کا خیال رکھنا

روزے کے کچھ آداب و حدود ہیں جن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:«مَنْ صَامَ رَمَضَانَ وَعَرَفَ حُدُودَهُ وَتَحَفَّظَ مِمَّا كَانَ يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَتَحَفَّظَ فِيهِ كَفَّرَ مَا قَبْلَهُ» (مسندِ احمد) "جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کی حدود کو پہچانا اور ان آداب کی محافظت کی کہ جو لائقِ محافظت تھے تو اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے"۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ نے فرمایا کہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سمع و بصر اور زبان کو محارم سے روزہ رکھوا، پڑوسی کو تکلیف دینے سے اجتناب کر اور شور شرابے سے الگ ہو کر سکینت اور وقار کا راستہ اختیار کر"۔ نافرمانی کے ارتکاب سے روزہ ناقص ہو جاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے:«رُبَّ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الْجُوعُ» (سنن ابنِ ماجہ) "کتنے ہی روزے داروں کو بھوک کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا" ۔امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ یا تو وہ ہیں جو حرام روزی سے روزہ افطار کرتے ہیں یا پھر غیبت وغیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں یا پھر وہ لوگ ہیں جو اپنے اعضاو جوارح کو حرام کاری سے نہیں بچاتے"۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:«مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ»(صحیح بخاری)"جو جھوٹی بات اور غلط کام کرنا نہ چھوڑے، اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ بھوکا پیاسا رہے"۔ بعض لوگ روزہ رکھ کر، دن بھر غضب ناک رہتے ہیں۔ گھر والوں اور ماتحتوں کو ڈانٹتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں " مجھے روزہ لگا ہوا ہے یا مجھے روزہ چڑھ گیا ہے"۔ یہ روزے کی برکات کو ضائع کرنے والا امر ہے اس لیے کہ روزہ تو ہی صبر کرنے کا نام، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «الصَّوْمُ جُنَّةٌ مَا لَمْ

يَخْرِقْهَا»(سننِ دارمی)"روزہ ڈھال ہے جب تک تم اسے توڑ نہ دو"۔ توڑنے سے مراد یہی ہے کہ روزے کے منافی کوئی قول وفعل کیا جائے۔ایک اور موقعے پر آپ ﷺ نے فرمایا: «الصِّيَامُ جُنَّةٌ وَإِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ يَوْمًا صَائِمًا فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَجْهَلْ وَإِنِ امْرُؤٌ قَاتَلَهُ أَوْ شَاتَمَهُ فَلْيَقُلْ:إِنِّي صَائِمٌ إِنِّي صَائِمٌ»(صحیح بخاری)"روزہ ڈھال ہے جس دن تم میں سے کسی کو روزہ ہو تو وہ نہ تو بے ہودہ گوئی کرے اور نہ ہی اشتعال میں آئے اور اگر کوئی دوسرا تم سے لڑے یا گالم گلوچ کرے تو اس سے کہے میں تو روزے سے ہوں میرا تو روزہ ہے"۔

نمازِ باجماعت کا اہتمام

کوشش کریں کہ پانچوں نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کریں۔ باجماعت نماز کا اجر و ثواب اکیلے کی نماز سے ستائیس گنا زیادہ دیا جاتا ہے اور پھر رمضان میں اس کا اجر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

نوافل وسنن کا اہتمام

رمضان میں نیکی کا اجر کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔لہذا کوشش کرنی چاہیے کہ نمازوں کے ساتھ متّصل سننِ موکدہ اور غیر موکدہ اور نمازوں سے متّصل نوافل نہ چھوٹنے پائیں۔ تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد، اوابین، اشراق، چاشت، صلاۃ الحاجت، صلاۃ التوبہ اور صلاۃ التسبیح کا خاص اہتمام کیا جائے۔

نمازِ تراویح

رَمَضان کا خصوصی وظیفہ نمازِ تراویح ہے۔جس میں رب کے حضور کھڑے ہو کر اس کا کلام سنا جاتا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو نبی کریم ﷺ ہر سال جبریل امین علیہ السلام کے ساتھ مل کر کیا کرتے تھے اور عمر مبارک کے آخری سال دوبار یہ مبارک عمل کیا گیا۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا:«مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»(صحیح بخاری)"جس نے ایمان و اخلاص کے ساتھ رمضان کا قیام کیا اس کے سابقہ گناہوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے"۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:«إِنَّ رَمَضَانَ شَهْرٌ افْتَرَضَ اللهُ صِيَامَهُ

وَإِنِّي سَنَنْتُ لِلْمُسْلِمِينَ قِيَامَهُ فَمَنْ صَامَهُ وَقَامَهُ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا خَرَجَ مِنَ الذُّنُوبِ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ» (صحیح ابنِ خُزیمہ) ''بے شک اللہ نے رمضان کے مہینے کے روزے فرض قرار دیے اور میں نے مسلمانوں کے لیے اس کا قیام سنت قرار دیا پس جو اس کے روزے رکھے اور اس کا قیام کرے ایمان واحتساب کے ساتھ تو گناہوں سے اس دن کی طرح پاک ہوجائے گا جب اس کی ماں نے اسے جنا تھا''۔

نمازِ تہجد

نمازِ تراویح کے ساتھ نماز تہجد کا اہتمام بھی کرنا چاہیے چاہے اتنی دیر جتنی دیر میں دو رکعت نماز پڑھی جا سکے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا: «لَا تَدَعُنَّ صَلَاةَ اللَّيْلِ، وَلَوْ حَلْبَ شَاةٍ» (المعجم الأوسط) ''رات کی نماز نہ چھوڑنا چاہے بکری کا دودھ نکالنے کی دیر ہی کیوں نہ پڑھو''۔ احادیث میں ساتھ گھر والوں کو بھی تہجد کی ترغیب دینے کی فضیلت بیان ہوئی ہے، اس لیے اہل وعیال کو بھی اس عمل میں شریف کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا أَيْقَظَ الرَّجُلُ أَهْلَهُ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّيَا أَوْ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ جَمِيعًا كُتِبَا فِي الذَّاكِرِينَ وَالذَّاكِرَاتِ» (سنن ابی داوٗد) '' جب مرد اپنی بیوی کو جگائے اور وہ دونوں دو ہی رکعت نماز پڑھیں پھر بھی وہ ذاکرین وذاکرات میں لکھے جائیں گے''۔

دعاومناجات کا اہتمام

رمضان کا مہینا چونکہ بخشش ومغفرت کا مہینا ہے اس لیے رمضان میں خاص اہتمام سے دعائیں مانگنی چاہییں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّا لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، فِي كُلِّ يَوْمٍ مِنْ رَمَضَانَ عُتَقَاءَ مِنَ النَّارِ، وَلِكُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ» (فضائلِ رمضان لابن شاہین) ''بے شک اللہ کی طرف سے رمضان کے ہر دن رات میں بہت سے لوگوں کو دوزخ سے نجات دے دی جاتی ہے اور ہر مسلمان مرد و عورت کے دعا قبول کی جاتی ہے''۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الصَّائِمُ لَا تُرَدُّ دَعْوَتُهُ» (مسندِ احمد) ''روزے دار کی دعا رد نہیں کی جاتی''۔ پس دورانِ روزہ،

نمازوں کے بعد اور سحر و افطار کے وقت خاص اہتمام سے دعائیں مانگنی چاہییں۔ بالخصوص افطار کے وقت، گھر والوں کو جمع کر کے دعا میں شریک کرنا چاہیے۔ ایک روایت میں وارد ہوا ہے: «كَانَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عَمْرٍو إِذَا أَفْطَرَ دَعَا أَهْلَهُ وَوَلَدَهُ وَدَعَا» (شعب الایمان) ”جب افطار کا وقت آجاتا تو سیدنا عبداللہ بن عمر بن العاص اپنے اہل و اولاد کو بلاتے اور پھر دعا کرتے“۔

تلاوتِ قرآن

لوحِ محفوظ سے سمائے دنیا تک قرآن حکیم کا یکبارگی نزول بھی رمضان المبارک میں ہوا اور نبی کریم ﷺ پر اس کی تنزیل کی ابتدا بھی رمضان میں ہوئی۔ نبی کریم ﷺ؛ جبریل امین علیہ السلام کے ساتھ مل کر سالانہ دور بھی رمضان ہی میں کیا کرتے تھے۔ اور امت کے لیے سالانہ دَورِ قرآنی کے لیے رمضان ہی کہ مہینا اختیار کیا گیا کہ اس میں حالت نماز میں قرآن کریم سنا یا سنایا جائے۔

رمضان میں دیگر اعمال کی طرح تلاوت کا اجر و ثواب بھی زیادہ کر دیا جاتا ہے تو رمضان میں بکثرت تلاوت کرنی چاہیے۔ عام حالات میں قرآنِ پاک کے ایک حرف کی تلاوت پر دس نیکیاں دی جاتی ہیں لیکن رمضان میں اس کا اجر اور بھی زیادہ ملتا ہے لہذا رمضان میں زیادہ سے زیادہ تلاوت کرنی چاہیے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور سلفِ صالحین رمضان میں قرآنِ کریم کے کئی دور مکمل کیا کرتے تھے۔ امام مالک اور حضرت سفیان ثوری رحمہما اللہ تمام کام چھوڑ کر تلاوت قرآن کی طرف متوجہ رہتے۔ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ رمضان میں ساٹھ دور مکمل کیا کرتے تھے۔ امام بخاری رمضان میں ہر دن ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ تعلق بالقرآن کے ضمن دوسری بات ترجمہ و تفسیرِ قرآن، دروسِ حدیث اور تعلیمِ فقہ کے حلقہ جات میں شرکت کرنا ہے۔ سلفِ صالحین رمضان میں درس و تدریس کے حلقے لگایا کرتے تھے۔ حضرت قتادہ رمضان میں قرآنِ کریم کی درس و تدریس کا خاص اہتمام کیا کرتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جب بصرہ کے امیر تھے تو وہ لوگوں کو جمع کرتے اور انھیں فقہ کی تعلیم دیا کرتے۔ رمضان میں تعلق بالقرآن کا خاص اہتمام کرنا چاہیے اور اس ضمن یہ فرمان نبوی یاد رہنا چاہیے: «الصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ

لِلْعَبْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، يَقُولُ الصِّيَامُ: أَيْ رَبِّ، مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِي فِيهِ، وَيَقُولُ الْقُرْآنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِي فِيهِ قَالَ فَيُشَفَّعَانِ»(مسندِ احمد)''روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے۔ روزہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پوری کرنے سے روکے رکھا تھا آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا: میں نے اس کو رات کے سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا خداوندا آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندے کے حق میں قبول کی جائے گی (اور اس کے لیے جنت اور مغفرت کا فیصلہ کر دیا جائے گا)''۔

زکاۃ وصدقات

جن لوگوں پر زکاۃ فرض ہے وہ رمضان میں اس کی ادائی کا اہتمام کریں۔ اگرچہ رمضان میں زکاۃ کی ادائی ضروری تو نہیں لیکن اگر رمضان میں زکاۃ ادا کر دی جائے تو اس کا اجر و ثواب بڑھا دیا جاتا ہے۔ صدقۂ فطر، ایک واجب مالی عبادت ہے جو ہر کھاتے پیتے گھرانے پر واجب ہے۔ یہاں تک کہ شیر خوار اور نابالغ بچوں کی طرف سے بھی فطرانہ ادا کیا جائے گا۔ نمازِ عید سے پہلے پہلے اس کی ادائی لازم ہے لیکن بہتر ہے کہ اس سے بھی پہلے کر دی جائے تاکہ مساکین عید کی تیاری کر سکیں۔ (تفصیلی احکام کے لیے کسی عالم مفتی سے رجوع کریں) رمضان میں صدقہ و خیرات کثرت سے کرنا چاہیے۔ روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ سخی اور فیاض تھے اور رمضان میں آپ ﷺ کی سخاوت عروج پر ہوتی اور آپ ﷺ لوگوں کو خیر پہنچانے میں چلتی ہوا سے زیادہ تیز ہو جایا کرتے تھے''۔ (صحیح بخاری) نبی اکرم ﷺ نے رمضان المبارک کو «شَهرُ الْمُوَاسَاة» یعنی ہمدردی کا مہینا بھی قرار دیا ہے۔ علامہ طیبی کے بقول یہ نام رکھنے سے مقصود، سخاوت و احسان کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ بندہ تمام لوگوں اور بالخصوص غریبوں اور پڑوسیوں پر خرچ کرے (المرقاۃ المفاتیح)۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: أَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟ ''افضل صدقہ کون سا ہے؟''۔ فرمایا: «صَدَقَةٌ فِي رَمَضَانَ» (سننِ ترمذی) ''رمضان میں صدقہ کرنا''۔

رمضان میں سخاوت کی ایک صورت افطار کی ضیافت ہے۔ سلمان فارسی سے مروی ایک حدیث یوں ہے:«مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا فِي رَمَضَانَ مِنْ كَسْبٍ حَلَالٍ صَلَّتْ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ» (المعجم الکبیر)"جس کسی نے روزے دار کو حلال کمائی سے افطار کرایا اس کے لیے فرشتے دعائیں کرتے ہیں"۔البتہ افطار کی دعوتوں میں دکھاوے اور کھانے کی مقدار و معیار میں اسراف اور بے جا تکلف سے بچنا چاہیے۔اسلاف کی خدمتِ روزے دار کے انداز مختلف تھے۔ بعض اوقات لوگوں کو دعوت افطار پر بلاتے، بعض افطار کا سامان بھجوادیتے، بعض حضرات مسجد میں افطار کا سامان رکھوادیتے۔ بعض افطار کے ساتھ کپڑے کا جوڑا بھی پیش کرتے۔ صدقہ وخیرات اور افطار میں جہاں پڑوسی اور رشتے داروں کا خیال رکھنا ضروری ہے وہاں آفت زدہ اور مظلوم مسلمانوں کے ساتھ بھی اس اس ضمن میں تعاون کرنا چاہیے۔

ذکرِ کثیر

اللہ کا ذکر کرنے کی بہت فضیلت ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ نمازِ فجر کے بعد نمازِ اشراق تک بیٹھ کر یا چلتے پھرتے اللہ کا ذکر کیا جائے جس میں کوئی بھی مسنون کلمات پڑھ لیے جائیں۔ اسی طرح نمازِ عصر کے بعد نمازِ مغرب تک کا وقت یا اس کا کوئی ایک حصہ ذکر کے لیے مخصوص کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے نمازِ فجر کے بعد طلوعِ شمس تک ذکر اور دو رکعت نماز ادا کرنے کا اجر عمرے اور حج کے برابر قرار دیا۔(سننِ ترمذی) اور نمازِ عصر سے مغرب تک ذکر کرنے کو بنی اسماعیل کے چار غلام آزاد کرانے سے بہتر قرار دیا۔(سننِ ابی داود)اس کے علاوہ چلتے پھرتے جہاں تک ہوسکے ذکر میں مشغول رہا جائے۔ ذکر کی برکت سے روزے کا اجر بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: أَيُّ الصَّائِمِينَ أَعْظَمُ أَجْرًا؟"روزے داروں میں زیادہ اجر پانے والا کون ہے؟"فرمایا:« أَكْثَرُهُمْ لِلَّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى ذِكْرًا»(مسندِ احمد)"ان میں سے اللہ کا زیادہ ذکر کرنے والا"۔

* * * * *

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ

قسط نمبر ۲۰

جمعیتِ اتحاد کے ۱۹۰۸ء کے سیکیولر انقلاب کے مخالف انقلاب ۱۹۰۹ء میں برپا کر دیا گیا۔ جمعیتِ ترقی واتحاد کے لوگوں کو استنبول سے نکال باہر کیا گیا لیکن یہ انقلاب برپا کرنے والے کوئی منظم قوت نہ تھے۔ بعض مورخین کی رائے تو یہ ہے کہ یہ سارا ہنگامہ جمیعت کی طرف سے ایک سازش کے تحت برپا کیا گیا تھا تاکہ اس کی آڑ میں سلطان کو معزول کیا جا سکے۔ (اسرار انقلاب عثمانی، مصطفی طوران) لیکن کم از کم درجے میں یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ یہ انقلاب نہ ہی کسی ٹھوس منصوبہ بندی کے تحت عمل میں لایا گیا تھا اور نہ ہی سلطان ان لوگوں کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ بلکہ یہ منتشر لوگوں کی کاروائی تھی۔ ان لوگوں نے وزیر اعظم کو معزول کر کے اپنی مرضی کا وزیر اعظم مقرر کیا۔ جمعیت کے جو لیڈر یہاں سے نکالے گئے تھے، انھوں نے اپنے مرکز سالونیک کا رخ کیا اور وہاں کی فوج سے مدد طلب کی۔ اب مقدونیہ سے بریگیڈ نمبر ۳، استنبول کی طرف روانہ ہوا، فوجیوں کے علاوہ غیر فوجی انقلابیوں کی ایک بڑی تعداد لشکر میں شامل تھی۔ یہ عثمانی دشمن عناصر تھے جن میں بلغارین، سربیائی، مقدونی، یونانی اور البانی گروہ شامل تھے۔ لشکر کی قیادت شوکت محمود پاشا کر رہا تھا۔ اس لشکر کو جیشِ حرکت کا نام دیا گیا تھا۔

سلطان کو جب اس لشکر کی روانگی کی اطلاع ملی تو انھوں نے استنبول میں موجود فوجوں کو یہ پیغام دیا: ”یہ جو ہنگامہ کھڑا کیا گیا ہے یہ نہ میری طرف سے ہے اور نہ میں نے اس کا حکم دیا ہے۔ بلکہ یہ دشمنوں کی ایک چال

ہے۔ تیسرا بریگیڈ استنبول کی طرف چلا آتا ہے۔ وہ تمھارے بھائی اور ترک ہیں۔ دیکھو کوئی بھی ۱۳/اپریل والے دن کی طرح اسلحہ نہ اٹھائے۔ میں تمام کمانڈروں کا اس کا حکم دیتا ہوں"۔

جب انقلابی لشکر استنبول کے نزدیک پہنچا تو شہر میں موجود بریگیڈ یر نمبر ایک کے سپاہیوں اور افسران نے اپنے سالار مختار محمود پاشا کی نافرمانی کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ کسی صورت سلانیکی لشکر کو استنبول میں داخل نہ ہونے دیں گے اور ڈٹ کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ جب سلطان کو پتا چلا تو انھوں نے فوجیوں کو اپنے سلام کے ساتھ اپنے کمانڈر کی اطاعت کا پیغام کہلا بھیجا۔ سلطان نے اپنے حمایتیوں کو سختی سے جنگ کرنے سے منع کیا۔ انھوں نے ناظم پاشا اور دیگر افسران سے قسم لی کہ وہ انقلابی لشکر کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں گے۔ بریگیڈ نمبر سات کے کمانڈر اسماعیل حقی پاشا فوجوں میں سلطان کا موقف عام کر رہے تھے اور سلطان کی طرف سے عدم تعرض کی قسم دلا رہے تھے۔ انقلابی فوجوں اور بالخصوص اس میں شامل غیر قوموں کو دیکھ کر عثمانی فوجوں کے بعض دستے اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور انھوں نے انقلابی لشکر پر فائر کھول دیا جس سے محدود سطح پر جھڑپیں ہوئیں جن میں زیادہ تر نقصان عثمانی فوجوں کا ہوا اور بہت سارے سپاہیوں نے جام شہادت نوش کیا۔

۲۵/اپریل ۱۹۰۹ء کو سلانیکی لشکر شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہوا۔ رومی اور بلغارین دستے پہلے پہل شہر میں داخل ہوئے۔ ان کی قیادت انور پاشا اور مقدونی انقلابی لیڈر ساندانیسکی کر رہے تھے۔ کمانڈر اسماعیل حقی جو فوجوں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے، ان کے ساتھ انور پاشا نے بدتمیزی کی، ان کی داڑھی نوچی اور انھیں قید کر دیا گیا۔ متحارب عثمانی فوجیوں میں سے جو بچے کھچے تھے انھوں نے ہتھیار پھینک دیے لیکن ساندانیسکی کے حکم پر اسلحہ پھینکنے والوں کو بھی قتل کر دیا گیا۔

جب قصرِ سلطان کا محاصرہ کیا گیا اور شاہی محل کی محافظ فوجوں نے مقابلے کی اجازت مانگی تو سلطان نے تاریخی جواب دیا: "میں جانتا ہوں کہ ان کا ہدف صرف میں ہوں، یا تو وہ مجھے معزول کریں گے یا مجھے قتل کریں گے۔ مجھے ان دونوں میں جو صورت بھی ہو قبول ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم لڑائی کرو اور دو طرفہ مسلمانوں کی جانیں ضائع جائیں۔ اس لیے کہ آنے والی مصیبتوں میں امت کو تمھاری ضرورت پڑے گی"۔

اس طرزِ عمل سے سلطان کی دانش مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی معزولی تو اصل میں یہ عالمی یہودی ایجنڈا ہے۔ موجودہ حادثات سے کافی پہلے اور ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے تقریبًا فوری بعد ہی سے صیہونی تنظیمیں، جلسے جلوس اور سیمینار منعقد کرنے لگی تھیں جن میں برملا سلطان عبد الحمید کی معزولی کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ یہود نواز اخبارات بھی بڑھ چڑھ کر سلطان کے خلاف لکھ رہے تھے۔ اس لیے سلطان موجودہ ہلے گلے کے اصل محرک سے واقف تھے۔ بہر حال انور پاشا اورساندا نیسکی بلغارین دستوں کے ساتھ قصرِ یلدز پر حملہ آور ہوئے۔ سلطان کے حمایتیوں کی طرف سے عدمِ مخاصمت کے باوجود انقلابی لشکر نے محل میں لوٹ مار مچائی۔ سونا چاندی، ہیرے جواہرات اور دیگر قیمتی چیزیں لوٹ لی گئیں۔ شاہی خزانے کے نگران نادر آغا اور جوہر آغا کو قتل کر کے خزانہ لوٹ لیا گیا۔ سلطان عبد الحمید رحمہ اللہ کو قید کر دیا گیا اور شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ مغرب کے بعد کوئی آدمی اپنے گھر سے نہ نکلے۔

۲۷/اپریل ۱۹۰۹ء: مجلسِ مبعوثان اور انقلابی اراکین پر مشتمل ''مجلسِ ملی'' کا خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا۔ اس میں یہ نکتہ زیرِ بحث لایا گیا کہ آیا سلطان سے استعفی طلب کیا جائے یا انھیں معزول کیا جائے۔ ہر طرف سے معزول معزول کی آوازیں بلند ہوئیں چنانچہ اسی پر اتفاق کیا گیا۔ اب سلطان کی معزولی کے لیے شیخ الاسلام کے فتوی کی ضرورت تھی۔ اگر چہ جمیعت اتحاد و ترقی ذاتی یا اجتماعی سطح پر دین کی عمل داری کا انکار کرتے تھے لیکن سلطان کو معزول کرنے کی مہم میں انھوں نے اسلام ہی کا سہارا لیا۔ انھوں نے سلطان پر اسلامی احکامات کی خلاف ورزی، مصاحف کے جلانے، قومی مال کے ضیاع اور ظلم وجور کے بے بنیاد الزام لگائے اور فرضی نام سے درج ذیل استفتا مرتب کرایا گیا: ''اگر زید مسلمانوں کا امام بنے اور پھر کتبِ شرعیہ میں منقول شرعی احکامات کی نہ صرف خلاف ورزی کرے بلکہ مذکورہ کتابوں کو جمع کر کے انھیں آگ لگا دے۔ اور بیت المال کے معاملے میں اسراف و تبذیر کا رویہ اختیار کرے اور خلافِ شریعت کاموں میں خرچ کرے اور بلا سببِ شرعی کے لوگوں کو قتل و قید اور جلا وطنی میں مبتلا کرے اور اس کے علاوہ بہت سارے مظالم کا ارتکاب کرے پھر وہ قسمیہ طور پر ان کاموں سے توبہ کرے لیکن پھر اپنی قسم توڑتے ہوئے پہلی روش پر گامزن ہو اور فتنہ پھیلائے تاکہ مسلمانوں کی طے کردہ انتظامیہ سے جان چھڑائے۔ ہر خطے کے مسلمانوں کا یہ اصرار ہے کہ زید نامی کو معزول کیا

جائے۔ زید کی بقا میں ضرر اور اس کے ہٹانے میں نفع یقینی ہے تو کیا ایسی صورتِ حال میں اہلِ حل و عقد اور اولیاے امر پر واجب ہے کہ زید کو معزول کریں"۔اس تفصیلی سوال کا مختصر جواب یوں لکھا گیا تھا: نَعَمْ یَجِبْ۔جی ہاں زید مذکور کو معزول کرنا واجب ہے۔ مورخین کی رائے یہ ہے کہ یہ بے سروپا الزام تھے، حتی کہ اتحادی لیڈر طلعت بک تک نے ان الزامات کا انکار کیا۔ پہلے دو الزامات کا جھوٹا ہونا تو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک اسراف کا الزام ہے تو سلطان، شہزادگی ہی کے دور سے بہت مالدار تھے اس کے باوجود دوسرے شاہزادوں اور سلطانوں سے معتدل خرچ کرنے والے تھے بلکہ ذاتی جیب سے بھی امورِ سلطنت میں خرچ کرنے والے تھے۔ جہاں تک ظلم و جور کے الزام کا تعلق ہے تو یہ سختی ان لوگوں پر کی گئی جو خفیہ تنظیمیں چلاتے تھے اور اس کا الزام بھی انھی کی طرف سے لگایا گیا۔ بہرحال ان الزامات کی روشنی میں دار الافتاء سے سلطان کی معزولی کے جواز کا فتوی مرتب کرایا گیا۔شیخ الاسلام محمد جمال الدین آفندی رحمہ اللہ نے اس فتوی کی تصدیق و تائید کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ انھیں اسی دن منصب سے ہٹا کر محمد ضیاء الدین آفندی کو شیخ الاسلام کے منصب پر لا بٹھایا گیا جس نے اس فتوی کی تصدیق و تائید کی۔

اس کارروائی کے بعد مجلسِ ملی میں یہ تحریر پڑھی گئی اور ایک کمیٹی بنا کر اس کے ذمے لگایا کہ وہ سلطان کو مجلس کے متفقہ اعلامیے اور فتوے کی روشنی میں ان کی معزولی کی اطلاع دے۔ اس کمیٹی میں ایمانویل قراصو، جو ہسپانوی الاصل یہودی تھا اور سالانیک اور استنبول کے درمیان اطلاعات کا ذمے دار تھا۔ آرام الارمنی کے علاوہ عارف حکمت، غالب پاشا اور اسعد پاشا شامل تھے۔ جب سلطان کو یہ فیصلہ سنایا گیا تو انھوں نے کہا: "مجھے حکومت کے چلے جانے کا دکھ نہیں ہے، دکھ تو مجھے ان لوگوں کی حرکات کا ہے"۔ پھر آپ نے ایمانویل کی طرف اشارہ کر کے اسعد پاشا سے پوچھا: "قصرِ خلافت میں اس یہودی کا کیا کام؟ خلافت کے اس کام میں تم ایک یہودی کو کس طرح میرے سامنے لاتے ہو؟"۔ یہود اور فری میسنری نے اس دن کو عید کی طرح منایا اور سلانیک میں اس انقلاب کے حق میں مظاہرے کیے گئے۔ سلطان کی حکومت کے خاتمے کے بعد یہودی اخبارات نے یہودی قومی سلطنت کے قیام کی بشارتیں شایع کیں۔ جمعیتِ اتحاد و ترقی کے ارکان کا دفاع کیا گیا اور انھیں محبِ وطن

ثابت کیا گیا تاکہ ان کی حکومت کے لیے ذہن سازی کی جاسکے اور سلطان کی کردار کُشی کی جانے لگی۔

سلطان کو ان کے خاندان کے اڑتیس آدمیوں کے ساتھ ٹرین میں بٹھا کر سلانیک روانہ کر دیا گیا۔ سلطان کی تمام زمین و جائداد اور قیمتی چیزیں ضبط کر لی گئیں۔ عام ضرورت کی بھی کوئی چیز سلطان کو ساتھ لے جانے نہیں دی گئی۔ انھیں ایک بڑی عمارت میں نظر بند رکھا گیا، جہاں جاوید بک کو ان کا نگران بنایا گیا۔ یہاں کسی کو آپ سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ آپ کی نگرانی پر مامور ایک افسر دیبریلی نے اپنی یاداشتوں میں بیان کیا کہ سلطان نے کہا: ''یہودیوں نے مجھے براہِ راست پیشکش کی کہ آپ فلسطین ہمیں دے دیں اور اس کے بدلے جتنا چاہیں سونا ہم سے لے لیں۔ میرا خون کھول اٹھا اور میں نے کہا کہ 'وطن بیچے نہیں جاتے'۔ میں نے کارندوں کو حکم دیا کہ انھیں قصرِ خلافت سے باہر نکال دیا جائے اور اب جو مجھے سلانیک میں قید رکھا گیا ہے تو یہ اسی کی سزا ہے''۔ سلطان نے کسی موقعے پر کہا تھا کہ ''یہود فلسطین میں صرف زراعتی رقبے قائم کرنے نہیں آرہے بلکہ وہ یہاں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے ارادوں سے واقف نہیں ہیں؟ نہیں، بلکہ وہ ہماری نظر میں ہیں۔ ہم اپنے تمام شہریوں سے کہتے ہیں کہ فلسطین میں ایک یہودی ریاست کے قیام سے چوکنا رہیں''۔ جمعیتِ اتحاد و ترقی کے بعض لوگ جو جمہوری سوچ تو رکھتے تھے لیکن انتہائی لبرل نہیں تھے، انھیں بعد میں اپنی غلطی کا ادراک ہوا۔ چنانچہ ایک بار انور پاشا نے جمال پاشا سے کہا کہ ''کیا تم جانتے ہو ہمارا گناہ کیا ہے؟ ہم نے سلطان عبد الحمید کو نہیں پہچانا۔ ہم صیہونیت اور فری میسنری کے آلۂ کار بن گئے اور ہم نے یہودیت کی خدمت کی، یہی ہمارا اصلی گناہ ہے''۔ ایوب صبری جو انقلابیوں کے ایک لیڈر رہے تھے انھوں نے افسوس کرتے ہوئے کہا: ''ہم اس وقت یہود کے ہاتھوں چند لیروں کے عوض بک رہے تھے جب سلطان لاکھوں کی مالی امداد کو ٹھکرا رہے تھے''۔

معزولی کے بعد سلطان عبد الحمید رحمہ اللہ نے اپنے شیخ حضرت ابو شامات محمود الشاذلی رحمہ اللہ کو ایک خط تحریر کیا جس میں انھوں نے یہود کی کوششوں اور اپنے جواب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا: ''جمعیتِ اتحاد و ترقی کے کارپردازان نے مجھے آمادہ کرنا چاہا کہ میں یہودیوں کے قومی وطن کی تشکیل میں ان کی مدد کروں۔ ان کے پرزور اصرار کے باوجود میں نے اس کام کی ہامی نہیں بھری۔ اس پر انھوں نے مجھے لالچ دینا چاہا کہ اگر میں

یہودیوں کو فلسطین میں قیام کی اجازت دوں تو سلطنت کے ذمے واجب الادا ایک سو پچاس ملین پاؤنڈ قرض ادا کر دیا جائے گا۔ میں نے یہ بھی نہ مانا اور صاف جواب دیا: "اگر تم دنیا بھر کا سونا مجھے دے دو تب بھی میں ہر گز ہر گز اس مکروہ دھندے میں شامل نہ ہوں گا۔ میں نے تیس سال سے زیادہ امت کی خدمت کی ہے، اب میں مسلمانوں کے صحیفے سیاہ نہ کروں گا"۔ میرے اس جواب پر ان لوگوں نے مجھے معزول کرنے پر اتفاق کر لیا اور مجھے آگاہ کر دیا گیا کہ مجھے سالونیک کی طرف جلاوطن کر دیا جائے گا۔ میں نے یہودیوں کے مقاصد پورا کرنے کے بجائے جلاوطنی اور معزولی کو پسند کیا۔ میں ربِّ کریم کا شکر ادا کرتا ہوں اور اسی کی حمد کرتا ہوں کہ جس کی توفیق نے مجھے (حکومت یا روپے کے) لالچ میں آکر عالمِ اسلامی کی ملامت اور یہودیوں کی چاکری کے عار اور عالمِ اسلام کی پھٹکار سے محفوظ رکھا"۔

جاری ہے

کتابیات

تاریخ دولة عثمانية،يلماز اوزتونا، مترجم:عدنان محمود سلمان

السلطان عبد الحميد و هرتزل، دكتور بها الأمير

الدولة العُثمانية – عَوَامِلُ النهُوض وأسباب السُّقوط، عَلي محمد محمد الصَّلاَّبي

القدس و المسجد الأقصى عبر التاريخ، دكتور محمد علي البار

المفصل في تاريخ القدس، عارف العارف

أسرار انقلاب عثماني، مصطفى طوران

* * * *

مفتی نذیر احمد ہاشمی مدظلہ
ضبط و ترتیب: مولانا عابد علی

القواعد الفقهية

القاعدة الثامنة: لا مساغَ للإجتهاد في مورد النص

جہاں نص موجود ہو وہاں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں

اجتہاد کے لغوی معنی

اپنی تمام تر قوت کے ساتھ اپنی تمام تر کوشش کو کسی فعل کے انجام دینے میں صرف کرنا اجتہاد کہلاتا ہے، اور یہ صرف اس موقعے پر استعمال کیا جاتا ہے جہاں کسی فعل کے کرنے میں مشقت اٹھانی پڑے۔

اجتہاد کے اصطلاحی معنی

احکامِ شرعیہ کے دریافت اور استنباط و استخراج میں پوری محنت اور جدوجہد اس طرح صرف کرنا کہ اس سے زیادہ محنت کرنے میں انسان اپنے آپ کو بے بس اور مجبور محسوس کرے۔

کن مسائل میں اجتہاد جائز ہے

ہر وہ مسئلہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نص موجود ہو تو مجتہد کے لیے اس میں اجتہاد کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ فرعی احکام میں اجتہاد یا قیاس کے جواز کے لیے شرط یہ ہے کہ شارع کی طرف سے کوئی نص موجود نہ ہو۔

نص کی موجودگی میں اجتہاد کی مثالیں

۱)حرمتِ ربا کے بارے میں نص موجود ہے، لہذا اِس کی حلت کے بارے میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہوگی۔

۲)وراثت میں بیٹی کے مقابلے میں بیٹے کا حصہ دگنا ہونے کے بارے میں نص موجود ہے، لہذا اجتہاد کے ذریعے بیٹی کے حصے کو بیٹے کے برابر نہیں کیا جائے گا۔

اس قسم کے اجتہادات، جو ان احکامِ شرعیہ کے خلاف ہوں، جن کے بارے میں نصوص موجود ہیں، جائز نہیں ہیں، کیوں کہ اجتہاد کی گنجائش نصوص کی عدم موجودگی کے ساتھ مقید ہے۔

تفریعات

۱)صریح حدیث موجود ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مدعی کے ذمے گواہ پیش کرنا اور مدعی علیہ کے ذمے قسم کھانا ہے، اب کسی مجتہد کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے برخلاف اجتہاد کرکے کہے کہ مدعی کے ذمے قسم کھانا اور مدعی علیہ کے ذمے گواہ پیش کرنا ہے، ایسے اجتہاد کا کوئی اعتبار نہیں اس لیے کہ صریح نص موجود ہے۔

۲)قرآنِ کریم میں صریح نص موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اب کسی مجتہد کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس بارے میں اجتہاد کرے کہ آیا بیع حلال ہے یا حرام، اس لیے کہ جب صریح نص موجود ہے کہ اب اس کے مقابلے میں اجتہاد کرنا جائز نہیں ہے۔

۳)قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے غیر شادی شدہ زنا کرنے والے مرد اور عورت کے متعلق فرمایا کہ انھیں سو کوڑے لگائے جائیں۔ اب کسی کے لیے ان کوڑوں کی تعداد کے متعلق اجتہاد کرنا جائز نہیں ہے کہ زانیہ مرد یا عورت کو کتنے کوڑے مارے جائیں اس طرح وہ تمام سزائیں اور کفارات جن کی شریعت نے کوئی حد مقرر کی، اِن کی مقدار میں اجتہاد کی گنجائش نہیں۔

۴)جوئے کی ممانعت نصِ صریح سے ثابت ہے، اب کوئی نص کے مقابلے میں اجتہاد کرکے جوئے کے جواز کو ثابت کرے تو شرعاً اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

* * * * *

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

شبِ براءت کی عبادت

سوال: شبِ براءَت کی عبادت اور روزے کے حوالے سے رہنمائی فرمادیں۔

جواب: ۱۵ شعبان کی شب (شبِ براءت) کے حوالے سے ہمارا معاشرہ افراط و تفریط کا شکار ہے۔ بعض افراد اس رات کی فضیلت کی مطلق نفی کرتے ہیں جب کہ بعض اس رات میں ان کاموں کا ارتکاب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جن کا قرآن و حدیث میں کوئی تذکرہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں طرح کے طرزِ عمل دو انتہاؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس رات کی فضیلت کے ضمن میں دس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے احادیث مروی ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ان میں سے بعض احادیث سنداً کمزور ہیں اور ان احادیث کے کمزور ہونے کی وجہ سے بعض افراد یہ خیال فرماتے ہیں کہ اس رات کی فضیلت ثابت نہیں، لیکن امت کے محدثین و فقہا کا فیصلہ یہ ہے کہ اگرچہ ایک روایت سند کے اعتبار سے کمزور ہو، اگر اس کی تائید میں بہت سی احادیث جمع ہو جائیں تو اس کی کمزوری دور ہو جاتی ہے، اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس رات کی فضیلت میں دس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے روایات موجود ہیں لہٰذا اس کو بے بنیاد کہنا غلط ہے۔

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اس رات میں عبادات انجام دینا باعثِ اجر و ثواب ہے۔ لیکن یہ عبادات انفرادی نوعیت کی اور تنہائی میں ہونی چاہییں۔ مساجد میں مجمع لگانا، خاص طریقے کی نماز ادا کرنا، چراغاں کرنا، حلوہ و دیگر فضولیات کا ارتکاب بدعت کے زمرے میں شمار ہوگا۔ ایک حدیث شریف میں ۱۵ شعبان کے

روزے کا ذکر ہے، حدیث سندی اعتبار سے نہایت کمزور ہے۔ لہذا سنت سمجھے بغیر اگر کوئی شخص ۱۵ شعبان کا روزہ رکھ لے تو بہتر ہے، کیونکہ شعبان کے مہینے میں روزہ رکھنے کی فضیلت دیگر احادیث میں وارد ہوئی ہے اور ۱۵ تاریخ ایامِ بیض میں سے ہے اور ایامِ بیض کے روزوں کی بھی حدیث شریف میں فضیلت آئی ہے۔ لہذا خاص پندرہ شعبان کے روزے کی فضیلت کا اعتقاد نہ ہو تو روزہ رکھ لینا بہتر اور مستحب ہے۔ حدیث شریف میں ہے: ”حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب نصف شعبان کی رات ہو تو رات کو عبادت کرو اور آئندہ دن روزہ رکھو، اس لیے کہ اس میں غروبِ شمس سے فجر طلوع ہونے تک آسمان دنیا پر اللہ تعالیٰ نزول فرماتے ہیں اور یہ کہتے ہیں ہے کوئی مغفرت کا طلبگار کہ میں اس کی مغفرت کروں؟ کوئی روزی کا طلبگار کہ میں اس کو روزی دوں؟ ہے کوئی بیمار کہ میں اس کو بیماری سے عافیت دوں؟ ہے کوئی ایسا؟ ہے کوئی؟ یہاں تک کہ فجر طلوع ہوجاتی ہے“۔(ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب ما جاء في ليلة النصف من شعبان)

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب اپنے رسالے میں پندرھویں شعبان کے روزے کے استحباب پر علمائے کرام کی تصریحات اس طرح نقل فرماتے ہیں: ”علمائے حنفیہ: حکیم الامت مجد دملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں: پندرھویں تاریخ شعبان کو روزہ رکھنا مستحب ہے۔(زوال السنہ) حضرت مفتیٔ اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ نے بھی اس کو پندرھویں شعبان کے مسنون اعمال میں شمار فرمایا یعنی اس کی صبح کو روزہ رکھنا مستحب ہے۔ علامہ قطب الدین محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے مشکوۃ شریف کی شرح مظاہر حق، جلد ۲، ص ۳۶۴ پر باب صیام التطوع میں پندرھویں شعبان کا روزہ بھی شمار فرمایا ہے۔ علمائے مالکیہ: (و) ندب صوم يوم النصف من شعبان لمن أراد الاقتصار (بلغة السالك لأقرب المسالك المعروف بحاشية الصاوي على الشرح الصغير للشيخ الدردير المالكی، باب الصوم، مندوبات الصوم) ترجمہ: یعنی شیخ دردیر مالکی علیہ الرحمہ نے پندرھویں شعبان کا روزہ مستحب قرار دیا ہے۔ علمائے حنابلہ: شیخ مردلوی حنبلی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب ”الانصاف“ میں تحریر

فرمایا: شیخ ابن جوزی علیہ الرحمہ نے "المستوعب" میں لکھا ہے کہ شعبان کے روزوں میں پندرھویں شعبان کا روزہ زیادہ مؤکدہ ہے۔ نیز ابنِ رجب حنبلی علیہ الرحمہ نے بھی فرمایا: پندرھویں شعبان کے روزے کا حکم خصوصیت سے آیا ہے"۔(ملخص از رسالہ: شب براءت کی حقیقت، از: مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہ) اسی طرح فتاویٰ ہندیہ اور مراقی الفلاح میں بھی ۱۵ شعبان کے روزے کو مستحب قرار دیا گیا ہے۔ فتاویٰ ہندیہ میں ہے: "اور جن روزوں کی ترغیب دی گئی ہے وہ مختلف ہیں، پہلا محرم کا روزہ، دوسرا رجب کا روزہ اور تیسرا شعبان کا روزہ"۔ مراقی الفلاح کتاب الصوم میں ہے: "ہر وہ روزہ جو شریعت میں مطلوب ہو اور اس پر ثواب کا وعدہ ہو وہ بھی مستحب ہوتا ہے"۔ لہذا بغیر سنت کی نیت کیے پندرہ شعبان کا روزہ رکھنا درست اور باعث اجر ہے۔

* * * *

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷۔۱۹۱۴ء)

فنِ بلاغت

مسلمانوں نے جو علوم و فنون خود ایجاد کیے اور جن میں وہ کسی کے مرہونِ منت نہیں، ان میں ایک یہ فن بھی ہے۔ عام خیال یہ ہے اور خود ہم کو بھی ایک مدت تک یہ گمان تھا کہ یہ فن بھی مسلمانوں نے یونانیوں سے لیا۔ ابنِ اثیر نے مثل السائر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "یونانیوں نے فنِ بلاغت پر جو کچھ لکھا ہے اگر چہ اس کا ترجمہ عربی میں ہو چکا ہے لیکن میں اس سے واقف نہیں اور اس لیے اس فن میں میں نے جو نکتے اضافے کیے ہیں، ان میں سے کسی کا میں مقلد نہیں بلکہ خود مجتہد ہوں"۔ ابنِ اثیر نے گو اپنے آپ کو یونان کی خوشہ چینی کے الزام سے بچایا ہے لیکن عبارت سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ اصل فن یونان ہی سے آیا تھا، لیکن اب اس خیال کی غلطی علانیہ ثابت ہو گئی۔ اصل یہ ہے کہ ارسطو نے ایک کتاب ریطوریقا کے نام سے لکھی تھی جس کو اس نے منطق کا ایک حصہ قرار دیا تھا۔ ریطوریقا وہی لفظ ہے، جس کو انگریزی میں ریٹارک کہتے ہیں۔ اردو میں اس لفظ کا ترجمہ خطابت یا فنِ تقریر ہو سکتا ہے۔ یہی کتاب ہے جس کی نسبت لوگوں کو دھوکہ ہوا کہ مسلمانوں کا فنِ بلاغت اسی سے ماخوذ ہے۔ اس کتاب کو شیخ بو علی سینا نے اپنی کتاب منطقیات شفا میں پورا پورا لے لیا ہے، یعنی اس کے مطالب اپنے الفاظ میں ادا کر دیے ہیں۔ ابنِ رشد نے اس کتاب کے اصل ترجمے کی جو اصلاح کی تھی، اس کا بڑا حصہ بیروت میں چھپ گیا ہے۔ یہ ذخیرے ہمارے سامنے ہیں اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا فنِ بلاغت ارسطو کی کتاب سے چھو بھی نہیں گیا ہے۔ ارسطو کی کتاب کا موضوع یہ ہے کہ جب کوئی تقریر کسی موقعے پر کی جائے تو امورِ ذیل قابلِ لحاظ ہوں گے:

(۱) مضمونِ تقریر کیا ہے؟ (۲) تقریر کے مخاطب کون لوگ ہیں؟ (۳) تقریر کرنے والا کون ہے؟

ان مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے تقریر کے مقدمات کس قسم کے ہونے چاہییں۔ چنانچہ ارسطو نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ واعظ، وکیل، حکیم، فریق مقدمہ وغیرہ وغیرہ کی تقریر کے اصول کیا ہیں؟ اور ہر ایک کے طریقۂ استدلال کو کس طرح ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہیے۔ اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ ارسطو کی یہ کتاب نہایت دقیق اور لطیف مباحث پر مشتمل ہے اور اگرچہ اس کا بھی سخت افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس کتاب سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا لیکن بہر حال مسلمانوں کا فنِ بلاغت ایک جداگانہ چیز ہے اور اس کے وہ خود موجد ہیں۔ فنِ بلاغت پر جہاں تک ہم کو معلوم ہے، سب سے پہلی جو کتاب لکھی گئی ہے، وہ دلائل الاعجاز، عبدالقاہر الجرجانی ہے، اس سے پہلے کی تصنیفیں بھی ہم نے دیکھی ہیں، لیکن در حقیقت ان کو اس فن کی تصنیف نہیں کہہ سکتے۔ دلائل الاعجاز کے بعد اور بہت سی کتابیں لکھی گئیں، یہاں تک کہ 'مطول' اور 'مختصر معانی' پر گویا خاتمہ ہوا۔

آج کل یہ فن جس طریقے سے پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہے، اس سے زیادہ کسی فن کی مٹی خوار نہیں، طلبہ اور علما ان لفظوں اور عبارتوں کو جو 'مختصر معانی' وغیرہ میں مذکور ہیں، بار بار دہراتے ہیں لیکن خود نہیں جانتے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جب انسان کسی فن کے مسائل کو سمجھ لیتا ہے اور اس پر حاوی ہو جاتا ہے تو جہاں کہیں ان مسائل کا موقع آتا ہے، انسان ان کو استعمال کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ مثلاً اگر تم نے عربی فنِ نحو میں مہارت حاصل کر لی ہے تو جب کوئی عربی عبارت تمھارے سامنے آجائے گی، تم اس کو بے تکلف پڑھتے چلے جاؤ گے۔ لیکن فنِ بلاغت کی درس و تدریس کی یہ حالت ہے کہ 'مختصر معانی' اور 'مطول' سو سو بار دہرا چکے ہیں، لیکن اگر قرآنِ مجید کی کوئی عبارت یا عربی کا کوئی شعر دے دیا جائے تو ہرگز نہ بتا سکیں گے کہ اس میں کیا کیا بلاغت کے اصول پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان درسی کتابوں میں مسائل بلاغت کو اس طرح صاف اور سلجھا کر نہیں لکھا ہے کہ طالب علم کے ذہن میں اصل مسئلے کی تصویر اتر جائے۔ مسئلہ ابھی پورا بیان بھی نہیں ہوا ہے کہ اس کے ساتھ لفظی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اور طالب علم کا ذہن ان بے ہودہ بحثوں میں پریشان ہو جاتا ہے۔

ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ان مسائل کے لیے کثرت سے مثالیں نہیں پیش کی جاتیں۔ عبدالقاہر

جرجانی نے جو مثالیں لکھ دی تھیں، وہی آج تک چلی آتی ہے بلکہ ان میں سے بھی بہت سی چھوٹ گئیں۔ مسائلِ بلاغت کے ذہن نشین کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اپنی زبان میں اس کی مثالیں سمجھائی جائیں۔ لیکن ہمارے علما عربی مثالوں میں اس قدر محدود ہیں کہ کسی اور زبان سے ان مسائل کی مثالیں پیش ہی نہیں کر سکتے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہم نے ارادہ کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً فنِ بلاغت کے مہمات مسائل اس رسالے میں اس طرح ادا کیے جائیں کہ مسئلے کی تصویر دل میں اتر جائے اور اس غرض کے لیے تمام مثالیں اردو کے کلام سے دی جائیں۔ چنانچہ اس پرچے میں ہم فصاحت کے مسئلے پر بحث کرتے ہیں، جو بلاغت کا پہلا زینہ ہے۔

فصاحت کی تعریف علمائے ادب نے یہ کی ہے کہ، ''لفظ متنافر الحروف نہ ہو، نامانوس نہ ہو، قواعدِ صرفی کے خلاف نہ ہو''۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ در حقیقت ایک قسم کی آواز ہے، اور چونکہ آوازیں بعض شیریں، دل آویز اور لطیف ہوتی ہیں۔ مثلاً طوطی و بلبل کی آواز اور بعض مکروہ و ناگوار مثلاً کوے اور گدھے کی آواز، اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، بعض شستہ، سبک، شیریں اور بعض ثقیل، بھدے، ناگوار۔ پہلی قسم کے الفاظ کو فصیح کہتے ہیں اور دوسرے کو غیر فصیح۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ فی نفسہ ثقیل اور مکروہ نہیں ہوتے لیکن تحریر و تقریر میں ان کا استعمال نہیں ہوا ہے، یا بہت کم ہوا ہے، ایسے الفاظ بھی جب ابتداءً استعمال کیے جاتے ہیں تو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں، ان کو فنِ بلاغت کی اصطلاح میں غریب کہتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں خلل انداز خیال کیے جاتے ہیں لیکن یہ نکتہ یہاں لحاظ کے قابل ہے کہ بعض موقعوں پر غریب لفظ کی غرابت اس وجہ سے کم ہو جاتی ہے کہ اس کے ساتھ الفاظ بھی اسی قسم کے ہوتے ہیں مثلا ایک شاعر کہتا ہے: ''عذریت رسول کی خاطر جلائی نار''۔ نار کا لفظ اس موقعے پر نہایت نامانوس اور بیگانہ ہے لیکن یہی لفظ جب ترکیبوں کے ساتھ اردو میں مستعمل ہوتا ہے، مثلا نارِ دوزخ، نارِ جہنم، تو وہ غرابت نہیں رہتی۔ فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہے، یعنی بعض الفاظ فصیح ہیں، بعض فصیح تر، بعض اس سے بھی بڑھ کر فصیح۔

معانی و الفاظ کی مناسبت

حسنِ کلام میں ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کے مختلف اقسام ہیں، مہیب، پر رعب، سخت، نرم، شیریں، لطیف۔ اسی طرح الفاظ بھی صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض نرم، شیریں اور لطیف ہوتے ہیں، بعض سے جلالت اور شان ٹپکتی ہے بعض سے درد اور غمگینی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی بنا پر غزل میں سادہ، شیریں، سہل اور لطیف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ قصیدے میں پرزور، شاندار الفاظ کا استعمال پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رزم و بزم، مدح و ذم، فخر و ادعا، وعظ و پند، ہر ایک کے لیے جدا جدا الفاظ ہیں۔

شعرا میں سے جو اس نکتے سے آشنا ہیں، وہ ان مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں اور یہ ان کے کلام کی تاثیر کا بڑا راز ہے، لیکن جو اس فرق مراتب سے واقف نہیں، یا ہیں لیکن ایک خاص رنگ ان پر اس قدر چڑھ گیا ہے کہ ہر قسم کے مضامین میں ایک ہی قسم کے لفظ ان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، ان کا کلام بجز ایک خاص رنگ کے بالکل بے اثر ہوتا ہے۔ یہی نکتہ ہے کہ سعدی سے رزم اور فردوسی سے بزم نہیں نبھ سکتی۔ فردوسی نے جہاں حضرت یوسف کی نالہ وزاری کو اپنی کتاب یوسف زلیخا میں لکھا ہے، لکھتا ہے، بغرید یوسف دگربارہ زار۔ رزم، بزم، فخر، حسرت، شوق، ہر ایک مضمون کے لیے خاص قسم کے الفاظ موزوں ہیں اور ان مضامین کے لیے انہی الفاظ کو استعمال کرنا چاہیے۔ مثلاً ایک شاعر نے جلال اور غیظ کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے   نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے
کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو   سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو
تھا یہ بپھرا ہوا عباس مرا شیر جواں   سینہ حر پہ رکھے دیتا تھا نیزے کی سناں
لرزہ تھا رعبِ حق سے ہر ایک نابکار کو   روکے تھا ایک شیر جری دس ہزار کو

ان اشعار میں جو الفاظ آئے ہیں، جس طرح ان کے معنی غیظ و غضب کے ہیں، اسی طرح ان الفاظ کی آواز اور لہجے سے بھی ہیبت اور غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔

کلام کی فصاحت

یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی۔ لیکن کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے، ان کی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو، ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ قرآنِ مجید میں ہے: ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى﴾ فواد اور قلب دو ہم معنی الفاظ ہیں اور دونوں فصیح ہیں، لیکن اگر اس آیت میں فواد کے بجائے قلب کا لفظ آئے تو خود یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا، جس کی وجہ یہ ہے کہ گو قلب کا لفظ بجائے خود فصیح ہے، لیکن ماقبل اور مابعد کے جو الفاظ ہیں ان کی آواز کا تناسب قلب کے لفظ کے ساتھ نہیں ہے۔ میر انیس کا مصرع ہے: ”فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور“۔ صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں اور دونوں فصیح ہیں، انیس نے مختلف موقعوں پر ان دونوں لفظوں کا استعمال کیا ہے اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کیا ہے لیکن اگر اس مصرعے میں صحرا کے بجائے جنگل کا لفظ آجائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔ ذیل کے شعر میں:

طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں ۔۔۔ جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

اگر جنگل کے بجائے صحرا لاؤ تو مصرعے کا مصرع پھس پھسا ہو جاتا ہے۔

شبنم اور اوس ہم معنی ہیں اور برابر درجے کے فصیح ہیں لیکن اس شعر میں،

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا ۔۔۔ تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائے گی۔ یہی ”اوس“ کا لفظ جو اس موقعے پر اس قدر فصیح ہے، اس مصرعے میں، شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے، شبنم کے بجائے لایا جائے تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے اس لیے یہ ضرور ہے کہ جن الفاظ کے سلسلے میں وہ ترکیب دیا جائے، ان آوازوں سے اس کو خاص تناسب بھی ہو۔ ورنہ گویا دو مخالف سروں کو ترکیب دینا ہوگا۔ نغمہ اور راگ مفرد آوازوں یا سروں کا نام ہے، ہر سُر بجائے خود دلکش اور دل آویز ہے، لیکن اگر دو مخالف سروں کو باہم ترکیب دے دیا جائے، تو دونوں مکروہ جائیں گے۔ راگ کے

دلکش اور مؤثر ہونے کا یہی گر ہے کہ جن سروں سے اس کی ترکیب ہو، ان میں نہایت تناسب اور توازن ہو۔ الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صوت اور سر ہیں، اس لیے ان کی لطافت، شیرینی اور روانی اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب گرد و پیش کے الفاظ بھی ان کے مناسب ہوں۔

دبیر کا مشہور مصرع ہے: ''زیرِ قدمِ والدہ فردوس بریں ہے''۔ اس میں جتنے الفاظ ہیں یعنی زیر، قدم، والدہ، فردوس، بریں، سب بجائے خود فصیح ہیں، لیکن ان کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرع پیدا ہوا، وہ اس قدر بھدا اور گراں ہے کہ زبان اس کا تحمل نہیں کر سکتی۔ شاید تم کو خیال ہو کہ مصرعے کی ترکیب چونکہ فارسی ہو گئی ہے، اس لیے ثقل پیدا ہو گیا ہے لیکن یہ فصیح نہیں۔ سیکڑوں شعروں میں اس قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں، لیکن یہ ثقل نہیں پایا جاتا، مثلاً میر انیس کہتے ہیں:

میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمدؐ کا مکیں　　　میں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خلدِ بریں

پہلے مصرعے میں فارسی ترکیب کے علاوہ توالی اضافات بھی موجود ہے، لیکن بھدا پن اور ثقل نہیں ہے۔ جب کسی مصرعے یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب، توازن اور توافق پایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرع یا شعر فصیح کہا جاتا ہے۔ یہی چیز جس کو بندش کی صفائی، نشست کی خوبی، ترکیب کی دل آویزی، برجستگی، سلاست اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کی نسبت خواجہ حافظ فرماتے ہیں:

آں راکہ خوانی استاد گر بنگری بہ تحقیق　　　صنعت گر است اما شعرِ روان ندارد

الفاظ کے توازن و تناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ ایک خاص مثال میں آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ میر انیس، حضرت علی اکبر کے اذان دینے کی تعریف ایک موقعے پر اس طرح کرتے ہیں، ''تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں''۔ اسی مضمون کو دوسرے موقعے پر اس طرح ادا کرتے ہیں، بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول ﷺ میں۔ وہی مضمون ہے، وہی الفاظ ہیں، لیکن ترکیب کی ساخت نے دونوں مصرعوں میں کس قدر فرق پیدا کر دیا ہے۔

ایتلاف الوزنِ مع المعنیٰ

ترکیبِ الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اجزا کی جو اصلی ترتیب ہے وہ بحال خود قائم رہے، مثلاً فاعل، مفعول، مبتدا، خبر، متعلقات فعل جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں، یہی ترتیب شعر میں باقی رہے۔ اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ اس ترتیب کا بعینہ قائم رہنا قریب قریب ناممکن ہے، صرف ایک آدھ شعر یا بہت سے بہت شعر دو شعر میں اتفاقیہ یہ بات پیدا ہو جاتی ہے مثلاً سعدی کے یہ اشعار:

بدو گفتم کہ مشکے یا عبیرے — کہ از بوے ولاویزِ تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم — ولیکن مدتے باگل نشستم
جمالِ ہم نشین در من اثر کرد — وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم

لیکن چونکہ نظم کا در حقیقت، سب سے بڑا املال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے۔ اس بنا پر شاعر کو کوشش کرنی چاہیے کہ اگر اصلی ترتیب پوری پوری قائم نہیں رہ سکتی، تو بہرحال اس کے قریب قریب پہنچ جائے۔ جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائے گا، اسی قدر شعر زیادہ صاف، برجستہ، رواں، اور ڈھلا ہوا ہوگا۔ مثلاً یہ اشعار:

کچھ تو ہوتے بھی ہیں وحشت میں جنوں کے آثار — اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں
دل نہیں مانتا جہاں جاؤں — ہائے میں کیا کروں، کہاں جاؤں

ماخذ: انتخابِ مضامینِ شبلی

* * * * *